الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خان
صدر اسلامی مرکز

سب سے زیادہ نادان وہ شخص ہے جو
چھوٹی چیز کی خاطر بڑی چیز کو کھو دے

جنوری ۱۹۹۰
شمارہ ۱۵۸

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۸ جنوری ۱۹۹۰

فہرست

ہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

انقلاب انگیز اثر

۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو دہلی پولیس نے کچھ اسکوٹر ڈرائیوروں کو پکڑا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ کسی نے پیلی لائن کو کراس کیا ہے۔ کسی نے ریڈ لائٹ پر اپنی گاڑی دوڑا دی ہے۔ ڈرائیوروں نے انکار کیا۔ ٹریفک پولیس نے ان سے زیادہ بحث نہیں کی۔ بس ان کے سامنے ایک ویڈیو فلم کھول دی۔ انھوں نے عملاً اپنی آنکھوں سے وہ واقعہ دیکھ لیا جس کا ان کے اوپر الزام تھا۔ اب ان کی زبان بند ہوگئی۔ انھیں اپنے جرم کا اقرار کر لینا پڑا۔

یہ الکٹرانک آنکھ (Electronic eye) کا کرشمہ تھا۔ دہلی پولیس نے حال میں ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی کرنے والوں کو پکڑنے کے لیے ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ اس نے ایک میٹاڈور میں ویڈیو کیمرہ اور مخصوص مشینیں نصب کر دی ہیں۔ اس کا پہلا تجربہ ۲ ستمبر کو تلک برج کے پاس کراسنگ پر کیا گیا۔ میٹاڈور میں لگا ہوا کیمرہ تمام گزرنے والی گاڑیوں کا خاموشی کے ساتھ فوٹو لیتا رہا۔ اس طرح اس نے تقریباً ۹۰ موٹر گاڑیوں کو خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑا۔ پولیس نے ان پر ایک سو سے ایک ہزار روپیہ تک جرمانہ کیا۔

ہندستان ٹائمس (۳ ستمبر ۱۹۸۹) کی رپورٹ کے مطابق، ڈاکٹر کے کے پال (اڈیشنل کمشنر آف پولیس، سیکورٹی اینڈ ٹریفک) نے اس کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ صرف یہ بات کہ اس قسم کی ایک پولیس گاڑی ویڈیو کیمرہ کے ساتھ دہلی کی سڑکوں پر متحرک ہے، یہی ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں کے اوپر مفید اثر ڈالنے کے لیے کافی ہے:

Just the fact that such a van with a video camera is moving around Delhi roads is going to have a salutary effect on traffic violators (p. 7).

یہی واقعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اس وقت پیش آتا ہے جب آدمی کو یقین ہو جائے کہ خدا کی آنکھ اس کو مستقل دیکھ رہی ہے اور خدا کے فرشتے ہر لمحہ اس کی کارگزاریوں کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ "خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے" بظاہر ایک سادہ عقیدہ ہے۔ لیکن اگر یہ عقیدہ صحیح طور پر پیدا ہو جائے تو آدمی کی پوری زندگی بدل جائے۔

پیغمبر اعظم

محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں خاتم النبیین (الاحزاب ۴۰) کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہے کہ آپ نبوت کی فہرست کی آخری کڑی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبیوں کو بھیجنے سے جو مقاصد مطلوب تھے، وہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ آخری طور پر مکمل کر دیے۔ اسی لیے آپ آخری نبی قرار پائے۔ آپ کے بعد اب مزید کسی نبی کو بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نبوت کے تمام مقاصد کی تکمیل ہونا صرف شخصی عقیدہ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک معلوم تاریخی واقعہ ہے۔ اسی لیے انگریز مورخ ٹامس کارلائل نے آپ کو پیغمبروں کا ہیرو بتایا ہے۔ امریکی پروفیسر مائیکل ہارٹ نے آپ کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان کہا ہے۔ کروروں اہل اسلام آپ کو تمام پیغمبروں میں سب سے اعظم اور افضل پیغمبر مانتے ہیں۔

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے، سب توحید کا پیغام لے کر آئے۔ مگر آپ سے پہلے تمام پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کا پیغام صرف دعوتی مرحلہ میں رہا۔ وہ انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہونچا۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی مدد سے اس کو عملی انقلاب کے مرحلہ تک پہونچا دیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کے دین میں تحریفات ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک کسی پیغمبر کا دین بھی تحریف سے خالی نہ رہا۔ آپ کے ذریعہ تاریخ نبوت میں پہلی بار ایسا ہوا کہ خدا کا دین تحریفات سے پاک ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک محفوظ دین کی صورت میں قائم ہو گیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مذہب نزاعی دور میں تھا۔ مذہب کے ساتھ وہ حقائق جمع نہیں ہوئے تھے جو اس کو ایک تاریخی مسلّمہ بنا دیں۔ آپ کے ذریعہ یہ عظیم کارنامہ انجام پایا کہ مذہب کی تحریک نزاعی مذہب کے دور سے نکل کر مسلّمہ مذہب کے دور میں داخل ہو گئی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مذہبی تعلیمات کی پشت پر ایک حقیقی عملی تاریخ موجود نہ تھی۔ آپ اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ پہلی بار ایسا ہوا کہ مذہب کی اعلیٰ تعلیمات مجرد تعلیمات نہ رہیں بلکہ ان کے پیچھے ہر اعتبار سے ایک مکمل واقعاتی تاریخ موجود ہو گئی ـــــ حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت میں بولا ہوا ہر لفظ ایک ثابت شدہ واقعہ ہے نہ کہ فرضی نوعیت کا صرف ایک شخصی عقیدہ۔

دے کر پانا

۱۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک عیسائی تاجر اپنے تجارتی گھوڑ
کو لے کر دریائے فرات کے پاس سے اسلامی سرحد میں داخل ہوا۔ زیاد بن حدیر نے اس سے محصول طل
کیا۔ اس نے محصول ادا کر دیا۔ واپسی میں وہ دوبارہ اسی راستہ سے گزرا تو زیاد نے اس کے غیر فروخت شدہ گھوڑو
سے دوبارہ محصول طلب کیا۔ تاجر کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس نے اپنے غیر فروخت شدہ گھوڑے اپنے غلامو
کی نگرانی میں وہیں چھوڑ دیئے اور خود چل کر مدینہ پہونچا تاکہ خلیفہ سے شکایت کرے۔ اس نے مدینہ
پہونچ کر حضرت عمر فاروقؓ سے اپنا قصہ بیان کیا۔ اور کہا کہ مجھ سے میرے گھوڑوں پر دوبارہ محصول طل
کیا جا رہا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی بات سن کر مختصر طور پر صرف اتنا کہا کہ کفیت (اس
انتظام کر دیا گیا ہے)

تاجر نے سمجھا کہ خلیفہ نے اس کی شکایت کو کچھ اہمیت نہ دی۔ وہ مایوسی کی حالت میں دریا
فرات کی چوکی پر واپس آیا اور زیاد کے مطالبہ کے مطابق محصول کی رقم ادا کرنے لگا۔ مگر زیاد نے اس
سے دوبارہ رقم نہ لی اور کہا کہ خلیفہ کی طرف سے یہ حکم آگیا ہے کہ تم سے دوبارہ محصول نہ لیا جائے۔

عیسائی تاجر اس بات سے بے حد متاثر ہوا کہ خلیفہ نے اتنی تیز کارروائی کی کہ میرا انصاف مجھ
پہلے یہاں پہونچ گیا۔ اس نے کہا کہ اے زیاد، میں مسیحیت کو چھوڑتا ہوں، اور میں اس آدمی کے د
کو اختیار کرتا ہوں جس نے تمہارے پاس یہ فرمان بھیجا ہے (یا زیاد انی بریئ من النصرانیہ
وانی علی دین الرجل الذی کتب الیک ھذا الکتاب، کتاب الخراج)

۲۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب چوتھے خلیفہ راشد تھے۔ ایک بار ان کی زرہ چوری ہوگئی۔ حض
علی کو معلوم ہوا کہ وہ فلاں یہودی کے پاس ہے۔ انھوں نے کوفہ کے قاضی شُریح کی عدالت میں دعو
دائر کیا۔ حضرت علیؓ نے اپنے دعویٰ کے حق میں دو گواہ پیش کیے۔ ایک اپنے غلام قنبر کو، اور دوس
اپنے لڑکے حسن کو۔ قاضی شریح نے کہا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں مقبول نہیں ہے اور صرف
ایک گواہ دعویٰ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ چنانچہ قاضی شریح نے مقدمہ خارج کر دیا۔ ز
بدستور یہودی کے پاس باقی رہی۔

یہودی اس فیصلہ کو سن کر بے حد متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ تو نبیوں جیسا معاملہ ہے کہ ایک
نی وقت کے حاکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے (ھذہ احکام الانبیاء قاضیہ یقضی علیہ)
ں کے بعد یہودی نے اسلام قبول کر لیا اور زرہ یہ کہہ کر حضرت علیؓ کو دے دی کہ یہ آپ ہی کی ہے،
پ کا دعویٰ بالکل درست تھا (کنز العمال)

۳۔ بنو امیہ کے زمانہ میں دمشق کی جامع مسجد بنائی گئی۔ مسجد کے ایک طرف ایک قدیم گرجا
ا۔ مسلمانوں نے چاہا کہ گرجا کا ایک حصہ مسجد میں شامل کر لیا جائے۔ مگر عیسائی اس کے لیے راضی نہ
ئے۔ خلیفہ عبد الملک نے اس کے لیے عیسائیوں کو ایک معقول رقم کی پیش کش کی پھر بھی وہ راضی نہ ہوئے
نچہ ابتدائی تعمیر میں مسجد کا ایک گوشہ ناقص رہا۔

اس کے بعد ولید بن عبد الملک کا زمانہ آیا تو اس نے بھی مسجد کی تکمیل کے لیے عیسائیوں کو راضی
نا چاہا مگر عیسائی دوبارہ راضی نہیں ہوئے۔ ولید بن عبد الملک نے اس زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا
ر اس کو مسجد میں شامل کر کے اس کی تعمیر مکمل کر دی۔ اس کے کئی سال بعد حضرت عمر بن عبد العزیز
فہ ہوئے۔ ان کے عدل وانصاف کی شہرت پھیلی تو عیسائیوں نے دوبارہ ان سے مل کر اپنی
بقہ شکایت کو پیش کیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کو سن کر حکم دے دیا کہ گرجا کی زمین کا
صہ مسجد میں شامل کیا گیا ہے اس کو توڑ کر عیسائیوں کے حوالہ کر دیا جائے۔

مسلمانوں کو یہ بات بے حد شاق گزری۔ انھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنی مسجد کو گرا دیں، حالاں کہ ہم
اس میں اذانیں دی ہیں اور نمازیں ادا کی ہیں (نھدم مسجدنا اذناّ فیہ وصلینا)
رت عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا کہ خواہ کچھ ہو، یہ زمین اگر مسیحی عبادت خانہ کی تھی تو وہ مسیحیوں
واپس کی جائے گی۔

مسیحیوں نے جب خلیفہ کے اس فیصلہ کو سنا تو وہ بے حد متاثر ہوئے۔ اب ان کا ذہن بدل
یا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا دعویٰ ثابت ہو گیا، ہم کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ اب ہم اس
ن کو اپنی طرف سے بطور ہدیہ مسجد کو دیتے ہیں (تاریخ بلاذری)

اس دنیا میں دینے والا پاتا ہے۔ اور جو شخص صرف پانا چاہے، وہ کھوتا ہے۔ یہ اس
کا اٹل قانون ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

قرآن کی طاقت

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹ - ۱۸۹۷) جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے معماروں میں سے تھے۔ آخر
میں وہ ہندستان کے صدر جمہوریہ بنائے گیے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے انتقال کیا۔ انھوں
ریڈیو پر بہت سی تقریریں کی تھیں۔ ایک تقریر میں انھوں نے اپنے ایک ابتدائی استاد کا ذکر ا
الفاظ میں کیا :

" خدا بخشے علی گڑھ کے مشہور استاد مولوی عباس حسین صاحب کو۔ فرمایا کرتے تھے کہ بھا
قرأتِ قرآن کا فن ختم ہو گیا۔ میرے اپنے استاد مرحوم (جن سے میں نے قرأت سیکھی) وہ اس
آخری جاننے والوں میں تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر " ق " کا صحیح تلفظ مٹکے کے اندر کر دوں
مٹکا پھٹ جائے " (بچوں کی تربیت، نیا کتاب گھر لاہور، صفحہ ۹۵)

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ قرآن جس کے اندر پہاڑوں کو ہلا دینے کی طاقت تھی (الحشر
جس کو سُن کر کتنے لوگوں کے سینے شق ہو گیے (مثلاً عمر فاروق) وہ بالآخر ایک ایسے فن تک جا پہونچ
بس مٹی کا ایک " مٹکا " توڑ سکتا تھا۔ اور اب یہ حال ہے کہ وہ کاغذ کے صفحات میں چھپا ہوا پڑ
ہے، اور اس کے اندر کسی بھی چیز کو توڑنے کی صلاحیت نہیں۔ حتیٰ کہ اغیار یہ کہنے لگے ہیں کہ قرآن ا
ایک ختم شدہ طاقت (Spent force) ہے، اب وہ کوئی کارنامہ انجام دینے کی صلاحیت نہیں
رکھتا، اور نہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں کوئی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

یہ حالت اس لیے نہیں ہے کہ خدانخواستہ قرآن میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے۔ قرآن میں آج بھی
تسخیری قوت ہے۔ آج بھی وہ انھیں طاقتوں کا خزانہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے جس کا اظہار اس کے
نزول کے ابتدائی زمانہ میں ہوا تھا۔ البتہ قرآن کے حاملین اس محفوظ خزانہ کو حاصل کرکے اس کو باہر
دنیا میں لانے کے قابل نہ رہے۔

قرآن کی لفظی قرأت اگر مٹکا توڑ سکتی ہے تو اس کا معنوی اظہار دلوں اور دماغوں میں زلز
پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اصل کمی یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں قرآن کے معنوی اظہار کے لیے کوئی حقیقی کوشش
ہی نہیں کی گئی۔ موجودہ زمانہ میں قرآن کا یہ پہلو ابھی تک غیر اظہار شدہ پڑا ہوا ہے۔

غلط رہنمائی

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے جب مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر کی، اس وقت حضرت ابراہیم نے یہ دعا فرمائی کہ اے ہمارے رب، تو ہم دونوں کو مسلم (مطیع) بنا۔ اور ہماری نسل سے ایک مسلم امت (مطیع امت) برپا کر (البقرہ ۱۲۹) اس واقعہ کے ڈھائی ہزار سال بعد جب یہ امت، امتِ محمدی کی صورت میں اٹھی تو پچھلی تاریخ کو یاد دلاتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ اللہ نے تمہارے باپ ابراہیم کی ملت کو تمہارے لیے پسند فرمایا ہے۔ ابراہیم نے تمہارا نام مسلم (مطیع) رکھا تھا اس سے پہلے (الحج ۷۸)

یہ قرآن کا طریقہ ہے۔ قرآن نے دورِ اول کے مسلمانوں کو عمل پر ابھارنے کے لیے ماضی کا حوالہ دیا۔ ان کو ان کے آبار واجداد کی یاد دلائی۔ مگر قرآن نے یہ زبان استعمال نہیں کی کہ —— اے مومنو، تم اسی ابراہیم کی اولاد ہو جس نے بتوں کو توڑ کر پاش پاش کر دیا۔ جس کے ایک کلمہ سے بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ جو اپنے وقت کے نمرودوں کو خاطر میں نہیں لایا۔ اس کے برعکس قرآن نے اہلِ ایمان کو حضرت ابراہیم کے اس پہلو کی یاد دلائی کہ انھوں نے تمہارا نام مسلم و مطیع رکھا تھا۔ وہ تم کو اطاعت گذار اور فرماں بردار دیکھنا چاہتے تھے۔

اب موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کو دیکھئے۔ یہ مسلم رہنما بھی مسلمانوں کو ان کی گزشتہ تاریخ یاد دلا کر ان کے اندر عمل کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کا طریقہ قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ ان میں سے کوئی شخص جب بولتا یا لکھتا ہے تو اس کی زبان یہ ہوتی ہے —— مسلمانو، تم وہی تو ہو جن کے اجداد نے قیصر و کسریٰ کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا۔ تم وہی تو ہو جن کی تلواروں کے آگے قومیں جھکنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ تم وہی تو ہو جنھوں نے شعلہ بن کر باطل کی خاشاک کو پھونک ڈالا تھا۔ تم وہی تو ہو جنھوں نے محتسبِ کائنات بن کر سارے عالم پر حکمرانی کی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے تاریخ کا حوالہ اس لیے دیا تھا کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اندر تواضع اور اطاعت گذاری کا جذبہ پیدا ہو۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما تاریخ کا حوالہ اس لیے دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر فخر اور حکمرانی کا جذبہ بیدار کریں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ بلاشبہ ان کی یہی غلط رہنمائی ہے۔

اِذن اللہ

قرآن میں ہے : کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله (کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آتی ہیں، البقرہ ۲۴۹) یہ موجودہ دنیا کے لیے اللہ کا قانون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں عزت اور برتری صرف انھیں لوگوں کا مقدر نہیں ہے جو تعداد اور وسائل میں زیادہ ہوں۔ یہاں کم تعداد اور کم وسائل والا گروہ بھی عزت اور سربلندی حاصل کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ اذن اللہ کی پیروی کرے۔

یہ اذن اللہ یا خدائی قانون کیا ہے، وہ الرعد (آیت ۱۷) کے مطابق یہ ہے کہ جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے، وہ زمین میں ٹھہراؤ اور استحکام حاصل کرتی ہے (واما ماينفع الناس فيمكث في الارض) یہی بات حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے (الید العلیا خیر من الید السفلیٰ) یعنی جو ہاتھ دوسروں کو دیتا ہے، وہ اس سے بہتر ہے جو دوسروں سے لینے والا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سماج میں ہمیشہ دو قسم کے گروہ ہوتے ہیں۔ ایک دینے والا گروہ (Giver group) اور دوسرا لینے والا گروہ (Taker group) زندگی کا یہ ابدی قانون ہے کہ جو گروہ لینے والا ہو اُس کو اِس دنیا میں پستی اور مغلوبیت کی سطح پر جگہ ملے۔ اور جو گروہ دینے والا گروہ بنے، اس کو دوسروں کے اوپر عزت اور برتری کا مقام حاصل ہو۔

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے احیاءِ ملت کے نام سے جو تحریکیں اٹھائیں، وہ زندگی کے اس شعور سے یکسر خالی تھیں۔ یہ لوگ اس بات کو نہ جان سکے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انھیں تخلیقی گروہ کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ اس کے بجائے انھوں نے مسلمانوں کو علاحدگی پسند گروہ (Separatist group) کے طور پر اٹھانے کی کوشش کی۔ ۱۹۴۷ سے پہلے اس علاحدگی پسندی کا اظہار جغرافیائی تقسیم کی شکل میں ہوا اور ۱۹۴۷ کے بعد ملی تشخص کی حفاظت کی صورت میں ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی ترقی کا راز علاحدگی پسندی میں نہیں بلکہ آفاقیت پسندی میں ہے۔ انھیں تخلیقی گروہ بننا ہے نہ کہ جامد گروہ۔ انھیں اپنا امتیاز خارجی مظاہر میں نہیں بلکہ معنوی حقیقتوں میں قائم کرنا ہے۔ وہ نفع بخشی کی زمین پر کھڑے ہو سکتے ہیں نہ کہ حقوق طلبی کی زمین پر۔

تصدیق، اعتراف

مطلوب انسانی شخصیت کے دو درجے ہیں۔ ایک تصدیق کا درجہ، اور دوسرا اعتراف کا درجہ۔
ن دونوں قسم کی شخصیتوں کے دو معیاری نمونے (Models) اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں قائم کر دیے ہیں۔
یک، ابوبکر بن ابی قحافہ کا نمونہ، اور دوسرا، عمر بن الخطاب کا نمونہ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کو بھی اسلام کی
رف بلایا، اس کے لیے اس میں کچھ نہ کچھ تاخیر اور سوچ اور تردد ہوا، سوا ابوبکر بن ابی قحافہ کے۔ جب میں
نے ان کے سامنے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کو قبول کرنے میں کچھ بھی پس و پیش نہ کیا (ما دعوت
حدا الی الاسلام الا کانت فیہ عندہ کبوۃ ونظر و تردد الا ما کان من ابی بکر بن ابی قحافۃ
ا عکم عنہ حین ذکرتہ لہ وما تردد فیہ، سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۶۸)

عمر بن الخطاب کے اسلام کا معاملہ اس سے مختلف صورت میں پیش آیا۔ ان کے قبول اسلام کا قصہ
فصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں آیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ اپنے گھر سے اسلام کو قتل کرنے کے ارادہ سے
نکلے اور جب اسلام (قرآن) کو سنا تو خود قتل ہو گئے۔ انھوں نے اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کو اس
لیے مارا کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ جب بہن کے جسم سے خون بہنے لگا تو اس کو دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا
ڑ گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے قرآن دکھاؤ۔ اس کے بعد انھوں نے سورہ طٰہٰ پڑھی۔ اس کو پڑھتے ہی ان
کے اندر اعتراف کی نفسیات جاگ اٹھی۔ ان کی زبان سے نکلا: ما احسن ھذا الکلام واکرمہ
(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۶۷)

ایک انسان وہ ہے جو پوری طرح فطرت خداوندی پر قائم ہے۔ اس کے سامنے سچائی آتی ہے تو
س کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ عین اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ وہ فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے۔ دوسرا
نسان وہ ہے جس کی فطرت پر ماحول کے اثر سے کچھ پردے پڑ گئے۔ تاہم اس کا انسانی جوہر بدستور پوری
طرح زندہ ہے۔ وہ ابتداءً شبہ اور تردد کا شکار ہوتا ہے۔ مگر جب دلائل سے بات واضح ہو جاتی ہے تو اس
کے بعد وہ حق کے آگے ڈھ پڑتا ہے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو دل و جان سے قبول
کر لیتا ہے۔ پہلے کردار کا مثالی نمونہ ابوبکر صدیق ہیں اور دوسرے کردار کا مثالی نمونہ عمر فاروق۔

عُسر میں یُسر

الم نشرح لك صدرك ووضعنا عنك وزرك الذی انقض ظهرك ورفعنا لك ذكرك فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا فاذا فرغت فانصب و الی ربك فارغب

کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا۔ اور تمہارا وہ بوجھ اتار دیا جو تمہاری پیٹھ توڑ رہا تھا۔ اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو محنت کرو، اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھو (الانشراح)

یہ سورہ مکہ کے ابتدائی زمانہ میں اتری۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہیں جب دعوت توحید کا آغاز کیا تو یہ ان تمام لوگوں کو دینی لحاظ سے غیر معتبر ٹھہرانے کے ہم معنی تھا جو غیر اللہ کی بنیاد پر بڑائی اور سرداری کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ آپ کے سخت دشمن ہو گئے۔ و آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے۔ اس صورت حال نے آپ کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا۔

اس وقت اس سورہ کے ذریعے آپ کو ایک سنت الٰہی سے باخبر کیا گیا۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں یُسر کا رشتہ عُسر سے بندھا ہوا ہے۔ اس دنیا میں مشکل کا پیش آنا کسی نئی آسانی کی تمہید ہو ہے، بشرطیکہ آدمی حوصلہ نہ کھوئے اور آنے والے بہتر مستقبل کا انتظار کر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت سے پہلے یہ مرحلہ گزرا کہ آپ حق کی تلاش میں سخت سرگرداں ہوئے۔ وقت کے ماحول اور مروجہ مذہب میں آپ کو اطمینان نہیں مل رہا تھا۔ "سچائی کیا ہے" اس سوال نے آپ کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون غارت کر دیا۔ یہ اضطراب اگرچہ ابتداءً "عسر" تھا، مگر اس کے اندر "یسر" کا پہلو نکل آیا۔ کیوں کہ اس نے آپ کو خشک زمین کی مانند بنا دیا تاکہ جب وحی کی صورت میں ہدایت آئے تو اس کی ایک ایک بوند آپ کے اندر جذب ہوتی چلی جائے۔ آپ بھرپور طور پر اس کو اخذ کریں۔ وہ پوری طرح آپ کے ذہن کو واضح اور روشن کر دے۔

دوسری چیز جو مذکورہ سنت کے لئے بطور مثال پیش کی گئی، وہ رفع ذکر کا معاملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید سے جن لوگوں کو مخالفت پیدا ہوئی، انھوں نے اس کو ناکا

کرنے کے لئے دعوت اور صاحب دعوت کو بدنام کرنے کی مہم شروع کر دی۔ وہ آپ کے خلاف اشعار کہہ کر اس کو پھیلاتے جو گویا اس زمانہ کی صحافت تھی۔ میلے اور بازار جو گویا اس زمانہ کے اجتماعات تھے، وہاں جاکر وہ لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے۔ وہ لوگوں کے سامنے آپ کی بری تصویر پیش کرتے تاکہ وہ آپ سے اور آپ کے سچے مشن سے بدگمان ہو جائیں۔

مخالفین نے عیب جوئی اور الزام تراشی کی جو مہم چلائی، اس کا مقصد ان کے اپنے خیال کے مطابق یہ تھا کہ صاحب دعوت کو بدنام کریں اور اس طرح لوگوں کو آپ کی دعوت سے متوحش کر دیں۔ مگر اس عسر میں بھی یسر کا پہلو نکل آیا۔ مخالفین کے نزدیک وہ آپ کو بدنام کرنے کی کوشش تھی، مگر دوسروں کے لئے وہ تجسس کے ہم معنی بن گئی۔ اس طرح آپ کی شخصیت نہایت وسیع پیمانہ پر لوگوں کے سامنے سوال بن کر کھڑی ہو گئی۔ ہر آدمی تفصیلی طور پر یہ جاننے کا طالب بن گیا کہ محمد کون ہیں اور ان کی دعوت کیا ہے۔

انسانی فطرت کبھی جزئی علم پر قانع نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ پوری بات جاننا چاہتی ہے۔ چنانچہ آپ کے خلاف کچھ باتیں سن کر لوگ اتنے ہی پر رک نہیں جاتے تھے، بلکہ وہ دعوت اور صاحب دعوت کے بارہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے براہ راست تحقیق کرتے تھے۔ وہ آپ سے ملتے اور قرآن کا مطالعہ کرتے۔ اس طرح مخالفین کی مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کی دعوت ان دور دور کے حلقوں میں پہنچ گئی جہاں آپ خود ابھی تک اس کو نہیں پہنچا سکے تھے۔ مخالفین نے آپ کو بدنام کرکے آپ کے بارہ میں لوگوں کے اندر شوق تحقیق پیدا کیا۔ اور جب ان لوگوں نے براہ راست تحقیق کی تو ان میں سے بہت سے لوگ آپ کی دعوت کو حق پاکر اس کے حامی بن گئے۔

اس سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ عُسر کے یُسر میں تبدیل ہونے کا دو تجربہ تم کرچکے ہو ــــ تلاشِ حق کی بے چینی کے بعد ہدایت کا ملنا، بدنامی کی مہم سے اشاعتِ دعوت کے نئے مواقع پیدا ہونا۔ اسی طرح اس سنت الٰہی کا تیسرا ظہور بھی عنقریب تمہارے سامنے آجائے گا۔ حالات کی فطری رفتار کو اپنی حد پر پہنچنے دو اور مستقبل کے ظہور تک صبر کے ساتھ اس کا انتظار کرو۔

اس تیسرے دور سے مراد دعوت اور صاحب دعوت کا نزاعی دور سے نکل کر مسلّمہ دور میں

داخل ہونا ہے۔ جس کو سورہ نصر میں "فتح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ موجودہ دور نزاع میں جو سخت حالات پیش آرہے ہیں، وہ آنے والے یسر کی تمہید ہیں۔ اس طرح وہ تمام ضروری اسباب جمع کئے جارہے ہیں کہ آئندہ جب مرحلۂ استحکام آئے تو وہ حقیقی معنوں میں استحکام اور ثبات بن سکے۔

اس عمل کے دوران دعوت کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہوجائیں۔ سچے انسان اور جھوٹے انسان ایک دوسرے سے الگ کردئے جائیں۔ یہ معلوم ہوجائے کہ کون واقعی معنوں میں حق کا طالب ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو حق کا نام صرف اس لئے لیتے ہیں کہ اس کی آڑ میں اپنا ذاتی مفاد حاصل کرسکیں۔ گم نامی میں پڑے ہوئے جواہر نکھر اٹھیں اور مصنوعی شہرت کا لبادہ اوڑھنے والے لوگ بے نقاب ہوجائیں۔

نیز یہ کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی فکر کو ماحول میں غلبہ حاصل ہو تو اس طرح ہو کہ وہ ان کا ایک ثابت شدہ حق بن چکا ہو، اور اسی طرح جب آپ کے مخالفین کو مغلوب کیا جائے تو یہ مغلوبیت اس طرح آئے کہ وہ لوگوں کو ایک کھلی ہوئی تاریخی ضرورت دکھائی دینے لگے۔

عُسر میں یُسر کا یہ تجربہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا، یہی آئندہ بھی آپ کے امتیوں کو ہوتا رہے گا، بشرطیکہ وہ اسی صراط مستقیم پر چلیں جس پر آپ چلے اور اسی صبر اور استقامت کا ثبوت دے سکیں جس کا ثبوت آپ نے اپنے زمانہ میں دیا۔

مہنگی قیمت

قدیم رومی شہنشاہ آکٹیوین (Octavian) جس کو آگسٹس (Caesar Augustus) بھی کہا جاتا ہے، ۶۳ ق م میں پیدا ہوا، اور ۱۴ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ حکمت کی باتوں کے لیے مشہور ہے۔ اس کا ایک قول انگریزی ترجمہ میں اس طرح نقل کیا گیا ہے:

Whoever seeks to obtain small benefits at the risk of great dangers is like a fisherman using a hook of gold: should it come off, no catch would compensate the loss.

جو شخص بڑے نقصانات کا خطرہ مول لے کر چھوٹے فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کی مثال اس مچھیرے کی سی ہے جو مچھلی پکڑنے کے لیے سونے کا کانٹا استعمال کر رہا ہو۔ اگر اس کا کانٹا نکل کر دریا میں گر جائے تو اس کا شکار خواہ کتنا ہی ہو، اس کے نقصان کی تلافی نہیں بن سکتا۔

حکمت کی یہ بات اب سے تقریباً دو ہزار سال پہلے کہی جا چکی تھی۔ مگر انسان آج بھی اس کو پوری طرح اختیار نہ کر سکا۔ آج بھی بے شمار افراد اور گروہ ملیں گے جو چھوٹے فائدے کو حاصل کرنے کے لیے بہت بڑے بڑے خطرے میں کود پڑتے ہیں۔ وہ چند مچھلیاں پکڑنے کی خاطر سونے کا کانٹا کھو دیتے ہیں۔

غلطی کی یہ قسم سب سے زیادہ جن لوگوں میں پائی جاتی ہے وہ قوم کے لیڈر ہیں۔ ایک لیڈر اپنے معمولی مفاد کے لیے قوم کو ایسی بربادی میں ڈال دے گا جس کی تلافی سیکڑوں سال میں بھی نہ ہو سکے۔ وہ اپنی وقتی مقبولیت کے لیے قوم کو مستقل ذلت کے گڑھے میں دھکیل دے گا۔ وہ اپنے چند سکوں کی خاطر پوری قوم کی اقتصادیات کو تہ و بالا کر دے گا۔ وہ اپنے حق میں سستی شہرت کے حصول کے لیے قوم کے افراد کی زندگی کو اتنی مہنگی کر دے گا کہ وہ اس کے اندر پس کر رہ جائیں۔

اگر کسی شخص کی پتنگ سمندر میں گر جائے تو وہ اس کو پکڑنے کے لیے سمندر کی موجوں میں نہیں کودے گا۔ وہ ایک پتنگ کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ مگر ملی اور قومی معاملات میں ہر لیڈر یہی نادانی کر رہا ہے۔ کیسے عجیب ہیں لیڈر اور کیسے عجیب ہیں ان کی پیروی کرنے والے عوام۔

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب است

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا ایک تردیدی مضمون الفرقان دسمبر ۱۹۸۹ میں شائع ہوا ہے۔ ایک بزرگ عالم نے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی اور ان کی کتاب تقویۃ الایمان پر تنقید کی گئی تھی۔ مذکورہ کتاب کا ایک بیان یہ ہے کہ "خاندان شاہ ولی اللہ کے حالات پڑھنے اور سمجھنے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مولانا اسماعیل نے واعظی کا پیشہ اپنالیا تھا" صفحہ ۵۳

اس بیان کے ثبوت اور شہادت کے طور پر مصنف کتاب نے "ارواح ثلاثہ" کے حوالہ سے امیر شاہ خاں صاحب کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ "حج سے واپسی کے بعد چھ مہینہ دہلی میں قیام رہا۔ اس زمانہ میں مولانا اسماعیل گلی کوچوں میں وعظ فرماتے تھے"

مگر یہ بالکل لغو اور بے دلیل بات ہے۔ مولانا اسماعیل شہید کے یہ مواعظ بطور "پیشہ" نہیں تھے بلکہ بطور "اصلاح" تھے۔ مسلمانوں کے اندر پھیلی ہوئی بدعات اور مشرکانہ اعمال کا انھیں بے پناہ درد تھا۔ وہ ان کو خالص توحید کی راہ پر لانا چاہتے تھے۔ اس تڑپ کے تحت وہ رات دن وعظ و نصیحت میں مشغول رہتے تھے۔ حتی کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی روایت کے مطابق، وہ ایک ایک دن میں بیس بیس جگہ وعظ کہتے تھے۔ یہ اصلاحی درد کی بنا پر تھا نہ کہ پیشہ ورانہ وعظ خوانی کی بنا پر۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے اپنے تردیدی مضمون میں اس سلسلہ کی بہت سی معلومات نقل کی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ مولانا اسماعیل شہید کی سرگرمیاں اصلاحی درد کی بنا پر تھیں نہ کہ پیشہ ورانہ وعظ خوانی کی بنا پر۔ اس مضمون کے آخر میں مولانا نعمانی نے فارسی کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے کہ عداوت کی آنکھ سے دیکھنے میں ہنر بھی بہت بڑا عیب بن جاتا ہے:

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب است

رائے قائم کرنے کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ کسی بات کو آدمی کس نظر سے دیکھتا ہے۔ سیدھی نظر سے دیکھنے میں ایک چیز عین درست معلوم ہوگی۔ مگر اسی کو ٹیڑھی نظر سے دیکھئے تو وہ سراسر غلط معلوم ہونے لگے گی۔ حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ جو چیز سب سے بڑا ہنر ہے وہ سب سے بڑا عیب بن جائے۔

الٹی تفسیر

قرآن کی سورہ الفتح میں اس واقعہ پر تبصرہ ہے جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔
ں کی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے :

اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب کہ وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اللہ کو معلوم
ھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، پس اللہ نے ان پر اطمینان (سکینت) اتارا اور ان کو ایک قریبی فتح
ے دی۔ اور بہت سی غنیمت بھی جس کو وہ لیں گے، اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔
للہ نے تم سے بہت سی غنیمت کا وعدہ کیا ہے جس کو تم لوگے۔ تو یہ تم کو فوراً دے دیا۔ اور اس
نے لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے، اور تاکہ یہ اہل ایمان کے لیے ایک نشانی ہو اور تاکہ اللہ
تم کو صراط مستقیم دکھائے (الفتح ۱۸-۲۰)

اردو کے ایک مفسر قرآن نے ان آیات میں سکینت اور صراط مستقیم پر جو تفسیری نوٹ لکھا ہے
وہ ان کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :

"یہاں سکینت سے مراد دل کی وہ کیفیت ہے جس کی بنا پر ایک شخص کسی مقصد عظیم کے لیے
ٹھنڈے دل سے پورے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو خطرہ کے منہ میں جھونک دیتا
ہے۔ اور کسی خوف یا گھبراہٹ کے بغیر فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ کام بہر حال کرنے کا ہے خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔
یعنی تمہیں مزید بصیرت اور یقین حاصل ہو، اور آئندہ تم اسی طرح اللہ اور رسول کی اطاعت
پر ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کے اعتماد پر راہ حق میں پیش قدمی کرتے چلے جاؤ۔ اور یہ تجربات
تمہیں یہ سبق سکھا دیں کہ خدا کا دین جس اقدام کا تقاضا کر رہا ہو، مومن کا کام یہ ہے کہ
خدا کے بھروسہ پر وہ اقدام کر ڈالے، اس حیص بیص میں نہ لگ جائے کہ میری طاقت کتنی ہے اور
ور باطل کی طاقتوں کا زور کتنا ہے"

اس موقع پر سکینت اور صراط مستقیم کی یہ تفسیر بالکل الٹی تفسیر ہے۔ یہاں سکینت سے مراد
یہ ہے کہ دشمن کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود ان کا سکون قلب برہم نہیں ہوا۔ انتہائی نازک
حالات میں بھی وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوئے۔ یہاں سکینت کا مطلب "نتیجہ کی پروا کیے

بغیر اپنے آپ کو خطرات میں جھونک دینا " نہیں ہے ، بلکہ اس کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے ۔ اس سے مراد اپنے آپ کو ضد سے اور اس منفی نفسیات سے بچانا ہے جب کہ آدمی یہ نادانی کرتا ہے کہ وہ نتیجہ کی پروا کیے بغیر اپنے آپ کو خطرہ کے منہ میں جھونک دیتا ہے ۔

یہی معاملہ صراطِ مستقیم دکھانے کا بھی ہے ۔ اس آیت میں صراطِ مستقیم سے مراد یہ نہیں ہے کہ آدمی " بس اقدام کر ڈالے ، وہ اس حیص بیص میں نہ پڑے کہ میری طاقت کتنی ہے اور باطل کا زور کتنا " اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے جو مذکورہ تفسیری نوٹ میں پرجوش الفاظ میں بتایا گیا ہے ۔ اس کا اصل مطلب اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونا ہے ۔ صلح حدیبیہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے واقعاتی طور پر مسلمانوں کو یہ راستہ دکھایا کہ کامیابی کا راز اکثر اوقات ٹکراؤ میں نہیں ہوتا ، بلکہ ٹکراؤ سے اعراض میں ہوتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت کا اگر وہ مفہوم لیا جائے جو مذکورہ تفسیر میں بتایا گیا ہے تو اس کی سب سے پہلی خلاف ورزی کرنے والے خود رسول اور اصحاب رسول قرار پائیں گے جن کے اوپر قرآن کی یہ آیت اتری ۔ کیوں کہ " حدیبیہ " کے موقع پر انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ وہ مخالفین کی مخالفتوں کی پروا کیے بغیر عمرہ کا اقدام کر ڈالیں ، وہ ہر حال میں مکہ میں داخل ہو جائیں ، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے ۔

فتح بغیر جنگ

مسٹر رچرڈ نکسن ۱۹۶۸ سے ۱۹۷۴ تک امریکہ کے پریسیڈنٹ تھے۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے ــــ ۱۹۹۹، جنگ کے بغیر فتح :

Richard Nixon, 1999: Victory Without War

اس کتاب میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان میں سے ایک بات امریکہ اور جاپان کے باہمی تعلق کے بارے میں ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر نکسن نے جو باتیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک بات مختصر طور پر یہ ہے :

> The Americans decimated Japan in 1945, and after World War II, rebuilt it with enormous economic backing as a model country to disprove the communist ideology that poverty cannot be removed through the process of capitalism. Democracy was planted on its territory in place of ancient monarchy. Its constitution was written by the Americans. Its defence was controlled from Washington DC. After 35 years of this experiment, bitter economic disagreements have clouded US-Japan relations in recent years. There is a terrific trade imbalance. In 1986 Japan sold goods to the US to the value of $60 billion in excess of the goods purchased from the States, contributing to the total American trade deficit of $170 billion. Indigenous rice production costs Japan $2,000 a ton, yet she is not prepared to buy rice from her benefactor, the US, offered at $180 a ton with a view "to protect Japanese farmers". The US is sore that the "Japanese have closed their markets to American goods" (p. 2).

امریکنوں نے ۱۹۴۵ میں جاپان کے بڑے حصہ کو تباہ کر دیا۔ پھر دوسری عالمی جنگ کے بعد انھوں نے زبردست اقتصادی امداد کے ذریعہ جاپان کی دوبارہ تعمیر کی۔ جاپان کے ساتھ یہ معاملہ انھوں نے اپنے ذاتی مقصد کے لیے، ایک نمونہ کے ملک کے طور پر کیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس اشتراکی نظریہ کو غلط ثابت کر سکیں کہ غریبی کو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ختم نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ جاپان میں قدیم بادشاہت کی جگہ جمہوریت لائی گئی۔ امریکنوں نے خود وہاں کا دستور بنا کر تیار کیا۔ اس کا دفاع مکمل طور پر واشنگٹن کے تحت کر دیا گیا۔

اس تجربہ کے ۳۵ سال بعد تلخ اقتصادی اختلافات کے بادل امریکہ اور جاپان کے تعلقات پر چھا گیے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی توازن ہولناک حد تک بگڑ گیا۔ ۱۹۸۶ میں امریکہ نے جتنا سامان جاپان کے ہاتھ بیچا، اس کے مقابلہ میں جاپان نے ساٹھ بلین ڈالر کے بقدر زیادہ سامان امریکہ کے ہاتھ فروخت کیا۔ واضح ہو کہ اس سال امریکہ کا کل تجارتی خسارہ ۱۷۰ بلین ڈالر تھا۔ جاپان اس پوزیشن میں ہو چکا ہے کہ اس نے امریکی چاول کی خریداری کے لیے ۱۸۰ ڈالر فی ٹن کی پیش کش کو رد کر دیا جب کہ اسے اپنے ملک میں چاول پیدا کرنے کے لیے ۲۰۰۰ ڈالر فی ٹن خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اب امریکہ کو یہ شکایت ہے کہ جاپانیوں نے امریکی سامان کے لیے اپنی مارکیٹ کو بند کر دیا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲ اپریل ۱۹۸۹)

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی حیثیت فاتح اور غالب کی تھی، اور جاپان کی حیثیت مفتوح اور مغلوب کی۔ مگر فاتح نے جو اقدامات اپنے مفاد کے لیے کیے، اس کو مفتوح نے اپنے مفاد میں تبدیل کر لیا۔ یہی موجودہ دنیا کا امتحان ہے۔ اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دشمن کے مخالفانہ منصوبوں میں اپنے لیے موافق پہلو تلاش کر لیں جو دشمن کی تدبیروں کو اپنے لیے زینہ بنا کر آگے بڑھ جائیں۔

اس دنیا میں شکست بھی فتح کا دروازہ کھولتی ہے۔ یہاں جنگ کے بغیر بھی کامیاب مقابلہ کیا جاتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ دانش مندوں کے لیے ہے۔ نادانوں کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی بھی حقیقی کامیابی مقدر نہیں۔ ان کے لیے فتح بھی شکست ہے اور شکست بھی شکست۔

مواقع کی بربادی

انڈین نیشنل کانگریس ۱۹ویں صدی کے آخر میں قائم ہوئی۔ اس کا پہلا سشن ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس سشن میں کل ۷۲ ڈیلی گیٹ شریک تھے۔ اس سشن کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ لندن کے اخبار ٹائمس (The Times) میں اس کی خبر شائع ہوئی تو انگریز نامہ نگار نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے مزید یہ الفاظ لکھے کہ اس اجتماع میں جو بات سب سے زیادہ محسوس ہوئی وہ یہ کہ اس میں ایک عظیم نسل موجود ہی نہ تھی، یعنی ہندستانی مسلمان:

Only one great race was conspicuous by its absence;
the Mahomedans of India were not there.
M.J. Akbar, Nehru: The Making of India, (p. 46).

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سو برس پہلے اس ملک میں مسلمانوں کا مقام کتنا اونچا تھا۔ کوئی سیاسی اجتماع یا کوئی سیاسی فیصلہ اس وقت تک نامکمل سمجھا جاتا تھا جب تک مسلمانوں کے نمائندہ افراد اس میں شریک نہ ہوں۔

تاہم "۱۸۸۵" میں مسلمانوں کا یہ مقام ان کے حال کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ یہ صرف ان کے ماضی کی بنیاد پر تھا۔ یعنی اس وقت مسلمانوں کے جو رہنما موجود تھے، ان کی اپنی بنائی ہوئی تاریخ کی وجہ سے انھیں یہ بلند مقام نہیں ملا تھا، بلکہ مسلمانوں کی سابقہ تاریخ کی بنا پر یہ مقام ان کے حصہ میں آیا تھا۔ یہ دراصل گزری ہوئی تاریخ کا تسلسل تھا جو اتفاقی طور پر ان کو حاصل ہو گیا۔

مگر وہ ماضی کے اس قیمتی اثاثہ کی قدر نہ کر سکے۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی اور بیسویں صدی کے نصف اول کے مسلم رہنماؤں نے اس کو مکمل طور پر کھو دیا۔ اگر وہ حاصل شدہ وسائل اور امکانی مواقع دونوں کو اچھی طرح سمجھتے اور حقیقت پسندانہ انداز سے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرتے تو یقیناً آج مسلمانوں کی تاریخ دوسری ہوتی۔ مگر اس معاملہ میں ان کا حال اس نالائق اولاد کا ہوا جو اپنے باپ کی وراثت میں ایک بڑا سرمایہ پائے اور پھر اس کو جھوٹی سرگرمیوں میں خرچ کر کے ضائع کر دے۔ یہاں تک کہ آخر میں اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے۔

زمانہ کے خلاف

ٹائمس آف انڈیا (۶ جولائی ۱۹۸۹) میں مسٹر رمن نندا کے قلم سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جو وزیر اعظم راجیو گاندھی کے صاحبزادہ راہل گاندھی سے متعلق ہے۔

راہل گاندھی نے نئی دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں ہسٹری (آنرز) کورس میں داخلہ لیا ہے۔ وہ اس مضمون کے لیے منتخب کیے جانے والے ۷۶ طلبہ میں سے ایک ہیں۔ راہل کے کالج جانے کے وقت کالج میں مسلسل پہرہ رہتا ہے۔ وہ کمانڈوز (Black Cats) کے زبردست پہرہ کے اندر کالج جاتے ہیں اور واپس لوٹتے ہیں۔

کالج کے ایک استاد ڈاکٹر ایس سی بھارگوا (فزکس لکچرر) کو "ایک طالب علم" کا ٹیلیفون ملا کہ وہ ان سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے اپنے مکان پر ملاقات کے لیے بلایا۔ ڈاکٹر بھارگوا جب وقت پر گھر پہنچے تو وہاں سیکورٹی کے لوگوں نے ان کے مکان کو گھیر رکھا تھا۔ ان کو مکان کے اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ انھیں صرف اس وقت داخلہ کی اجازت ملی جب کہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ وہی ڈاکٹر بھارگوا ہیں جن سے ملنے کے لیے مذکورہ طالب علم یہاں آیا ہوا ہے۔

یہ وی وی آئی پی طالب علم وزیر اعظم راجیو گاندھی کا بیٹا راہل گاندھی تھا۔ رپورٹ میں بتایا ہے کہ راہل نے ڈاکٹر بھارگوا سے یہ مشورہ چاہا تھا کہ وہ اقتصادیات کا مضمون لے یا تاریخ کا مضمون۔ ڈاکٹر بھارگوا نے اس کو بتایا کہ طالب علم کے نمبر کو دیکھتے ہوئے اقتصادیات کے کورس میں اس کا داخلہ مشکل ہوگا، اس لیے اسکو اقتصادیات کے بجائے تاریخ کا مضمون لینا چاہیے:

Rahul, who sought Dr. Bhargava's advice on whether he should take up economics or history, was told by the lecturer that considering his percentage, admission to the economics course may be difficult and he should instead opt for history (p. 5).

جہاں تعلیمی مقابلہ کا یہ حال ہو کہ وزیر اعظم کے بیٹے کو بھی میرٹ کی بنیاد پر داخلہ ملے وہاں رعایتی داخلہ کا مطالبہ کرنا عجیب بھی ہے اور ناقابلِ حصول بھی۔

نئے دور کا آغاز

انگریزی کے ایک مسلم ہفت روزہ نے اپنی اشاعت ۱ ۔ ۷ اکتوبر ۱۹۸۹ کے صفحہ اول کے مضمون میں لکھا ہے کہ بابری مسجد کے اشو کو لے کر آر ایس ایس، بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور شیو سینا مسلسل طور پر مسلمانوں کو مشتعل کرنے والی باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ مسلمان بھڑک کر تشدد کی کارروائی کریں تاکہ انھیں مسلمانوں کے خلاف فساد کرنے کا موقع ملے۔ مگر مسلمان صبر سے کام لے رہے ہیں۔ وہ اس سے انکار کر رہے ہیں کہ ان کی اشتعال انگیز باتوں سے وہ مشتعل ہو جائیں، جیسا کہ انھیں کرنا چاہیے:

Muslims are refusing to be provoked, as they should.

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ مسلمان بڑے پیمانہ پر صابرانہ پالیسی کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہیں ہو رہے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل پہلی بار پیش آرہا ہے کہ کسی مسلم اخبار کو مسلمانوں کے بارہ میں مذکورہ بالا الفاظ لکھنے کے لیے ملیں۔

ورنہ ۱۹۴۷ کے بعد سے مسلسل اس سے مختلف ذہن ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے تمام رہنما اور دانشور صرف ایک بات بولنا اور لکھنا جانتے تھے ۔ وہ یہ کہ مسلمان جب کسی بات پر مشتعل ہوں تو وہ ان کے مشتعل ہونے کو فطری ردعمل قرار دے کر اس کی توجیہ کریں۔ مثلاً اسی مذکورہ انگریزی اخبار نے اپنی اشاعت ۹ جون ۱۹۸۴ میں بھیونڈی اور بمبئی کے علاقہ میں مسلمانوں کے ردعمل کا ذکر کیا تھا جس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کے ردعمل کو جائز قرار دیتے ہوئے اخبار مذکور نے لکھا تھا کہ ——— مگر ایک شخص کو یہ کہنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا کہ اس سلسلہ میں ابتدائی اشتعال شیو سینا کے لیڈر کی طرف سے فراہم کیا گیا تھا:

But one need not strain one's commonsense to conclude that the initial provocation had come from the Shiva Sena chief.

حقیقت یہ ہے کہ چالیس سال سے تمام رہنماؤں اور دانشوروں کو ایک ہی بولی معلوم تھی ۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کا ردعمل فطری ہے، کیونکہ وہ فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیزی کے بعد سامنے آیا ہے۔ "اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا" ایک ایسا تصور ہے جو لیڈروں اور دانشوروں کی پوری جماعت کے لیے

یکسر لامعلوم تھا۔ اسی بنا پر وہ عام مسلمانوں کے لیے بھی لامعلوم بنا ہوا تھا۔ کیوں کہ یہ انھیں بتایا ہی نہیں گیا تھا۔

الرسالہ نے پچھلے تقریباً پندرہ سال کے اندر اس نئے تصور کو اتنی طاقت کے ساتھ پھیلایا کہ آج وہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کا پسندیدہ فکر بن گیا۔ اس کا عملی ظہور اس طرح شروع ہو چکا ہے کہ ۱۹۸۹ء میں انتہائی گرم ماحول کے باوجود مقابلۃً بہت ہی کم فسادات ہوئے۔ رپورٹیں بتا رہی ہیں کہ جگہ جگہ مسلمان صبر اور اعراض کی پالیسی کو اختیار کر کے فساد کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے کچھ سطحی لیڈر اگرچہ اب بھی ردعمل کی آگ بھڑکانے میں مشغول ہیں، مگر اللہ تعالیٰ الرسالہ کے ذریعہ اس آگ کو مسلسل بجھا رہا ہے (المائدہ ۶۴)

الرسالہ مشن کی پیدا کردہ اسی صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارے اخباروں کو پر فخر طور پر وہ الفاظ لکھنے کو مل رہے ہیں جس کی ایک مثال اوپر نقل کی گئی۔ یہ اخبارات اگر دیانت دار ہوں تو ان کے لیے زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اپنے مضامین میں اس طرح کے الفاظ لکھیں کہ ——— ہم نے تو مسلمانوں کو ردعمل کی آگ میں جھونکنے کی پوری کوشش کی تھی، مگر یہ الرسالہ کا کارنامہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو جوابی اشتعال سے بچا لیا اور وہ فساد کی بھیانک آگ میں جلنے سے محفوظ رہے۔

بابری مسجد تحریک ہندستان میں جذباتی اندازِ کار کا خاتمہ اور حقیقت پسندانہ اندازِ کار کا آغاز ہے۔ اس تحریک نے ایک طرف نام نہاد مسلم قیادت کو ہمیشہ کے لیے پیچھے دھکیل دیا۔ اور دوسری طرف اس قیادت کے کھنڈر سے الرسالہ مشن کو نئی طاقت کے ساتھ اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ فللہ الحمد۔

ایجنسی ایک پروگرام

اگر آپ الرسالہ کو پسند کرتے ہیں تو الرسالہ کی ایجنسی لیجیے۔ الرسالہ کی ایجنسی لینا اپنی پسند کو ایک متحرک مشن بنا دینا ہے۔

ایک نمونہ

مسٹر ششی پرشاد گوئل (۲۲ سال) میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۸۹ کے سول سروسز امتحانات میں انھوں نے ٹاپ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آئی اے ایس میں شرکت سے ان کا مقصد روپیہ کمانا نہیں ہے۔ بلکہ اس جاب کی باعزت حیثیت (Dignified status) ان کے لیے کشش کا باعث ہوئی۔

مسٹر گوئل کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۸ جون ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ بھی کہ سول سروس میں داخل ہونے کا ذہن ان کے اندر اس وقت بنا جب کہ انھوں نے مسٹر جاوید عثمانی کا انٹرویو پڑھا۔ مسٹر عثمانی نے محض اپنی ذاتی محنت سے ۱۹۸۱ کے سول سروس امتحان میں ٹاپ کیا تھا۔ وہ ان کے نمونہ سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ اس وقت سے ان کا یہ ذہن بن گیا کہ ایک شخص سول سروس کے ذریعہ قوم کی زیادہ بہتر خدمت کر سکتا ہے:

> His mind was made up after he read the interview of Mr. Javed Usmani, the topper in the civil services examinations in 1981. "I was so inspired by his example that since that day I have thought that one can serve the nation best only through the civil services" (p. 3).

مسٹر جاوید عثمانی کے پاس کہنے کے لیے اگر یہ ہوتا کہ اس ملک میں تعصب ہے، یہاں ان کے لیے ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ تو مسٹر گوئل کو ان کے کلام سے کوئی تحریک نہ ملتی۔ مگر جب انھوں نے تعصب کو نظر انداز کر کے محنت کو ترقی کا زینہ بنایا تو مسٹر گوئل کو اس میں خود اپنی ترقی کا نسخہ مل گیا۔ اس کو اختیار کر کے وہ ایک باعزت عہدہ تک پہونچ گیے۔

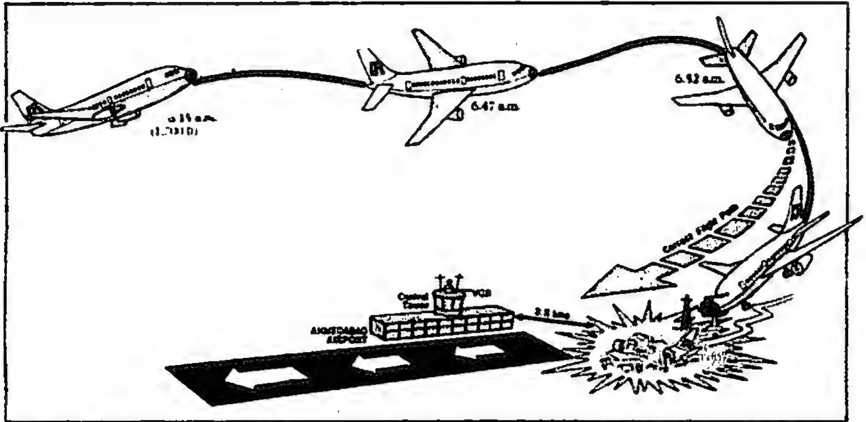
آج مسلمان اس ملک میں احتجاجی گروہ (Protestant group) بنے ہوئے ہیں۔ اگر وہ مسٹر جاوید عثمانی کی طرح اپنی افادیت ثابت کریں تو وہ اس ملک میں تخلیقی گروہ (Creative group) بن جائیں گے۔ احتجاجی لوگ نہ اپنے آپ کو کچھ دیتے ہیں اور نہ دوسروں کو۔ مگر جو لوگ تخلیقی گروہ کی حیثیت حاصل کر لیں وہ خود بھی پاتے ہیں اور دوسروں کو بھی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس ملک میں تخلیقی گروہ بننے کے امکانات پوری طرح موجود تھے۔ مگر ان کے لیڈروں کی جھوٹی سیاست نے انھیں اس کے سوا کسی قابل نہ رکھا کہ وہ اس ملک میں بے اثر احتجاجی گروہ بن کر رہ جائیں۔

عبرت ناک حادثہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کا ایک سیدھا راستہ ہے، اور کچھ ٹیڑھے راستے بھی ہیں۔ سیدھے راستہ پر چلنے والا بحفاظت اللہ تک پہونچتا ہے، اور جو لوگ ٹیڑھے راستوں پر چلیں وہ آخر کار برباد ہو کر رہ جاتے ہیں (النحل ۹) دنیا میں بار بار ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس معاملہ کو تمثیل کے روپ میں بتلاتے ہیں۔ جو آدمی کو اس سنگین حقیقت کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں ایسا ہی ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

انڈیا ٹوڈے (۱۵ اکتوبر ۱۹۸۹) میں ایک ہوائی حادثہ کی باتصویر تفصیلات چھپی ہیں۔ یہ اس کورٹ آف انکوائری کی رپورٹ پر مبنی ہیں جو اس سلسلہ میں جسٹس اے کے ماسھُر کی سربراہی میں حکومت کی طرف سے مقرر کی گئی تھی۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ کو انڈین ایر لائنز کا ایک جہاز (فلائٹ ۱۱۳) بمبئی سے احمد آباد کے لیے اڑا۔ روانگی سے ۳۰ منٹ پہلے فلائٹ ڈسپیچ آفیسر اے کے بزجی نے جہاز کے پائلٹ کو ایک ٹائپ کی ہوئی شیٹ دی۔ پائلٹ کا نام مسٹر دلایا تھا۔ یہ معمول کی شیٹ تھی جس کو ایرپورٹ کی اصطلاح میں نوٹم (Notam) کہا جاتا ہے۔ یعنی ہوائی عملہ کے لیے ضروری اطلاع



(Notice to airmen) اس شیٹ میں درج تھا کہ احمد آباد ایرپورٹ کی رہنما روشنیاں اور لینڈنگ کے مددگار آلات ناکارہ (Non-functional) حالت میں ہیں۔ مگر آخری لمحات میں پائلٹ اور کو پائلٹ کے درمیان گفتگو کا جو ریکارڈ "بلیک باکس" کے ذریعہ ملا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پائلٹ نے مذکورہ معلوماتی شیٹ کو نہیں پڑھا۔ انھوں نے اس کو پڑھے بغیر ایک خانہ میں ڈال دیا اور اپنا سفر شروع کر دیا۔

وہ بے خبری کے ساتھ ہوائی جہاز کو اڑاتے ہوئے احمد آباد کے قریب پہونچے۔ پھر وہ اترتے ہوئے ایک ہزار فٹ کی بلندی تک آگیے۔ ان پر لازم تھا کہ وہ ان ضروری احتیاطوں کو ملحوظ رکھیں جو آلات کی مدد کے بغیر آنکھ سے دیکھ کر اترنے کی صورت میں اختیار کی جاتی ہیں۔ اس کے بجائے انھوں نے ایرپورٹ کے آلات کی رہنمائی پر بھروسہ کیا جو اپنی ناقص کارکردگی کی وجہ سے انھیں غلط اطلاعات دے رہا تھا۔

جہاز جب ایرپورٹ سے تقریباً دو کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا تو وہ اپنے صحیح راستہ سے ہٹ گیا۔ فضا میں کہر ہونے کی وجہ سے ایرپورٹ بھی زیادہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاز رن وے پر اترنے کے بجائے باہر ناہموار زمین پر اتر گیا۔ ایک سکنڈ کے اندر جہاز کے اندر آگ لگ گئی۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ یہ واقعہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ کو صبح ۷ بجے پیش آیا۔ ۱۳۸ مسافر ہلاک ہوگیے۔ صرف دو آدمی شدید زخمی حالت میں بچ سکے۔ بالمقابل صفحہ پر اس کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ ایک دنیوی مثال ہے جس سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کا ہر آدمی گویا ایک مسافر ہے۔ ہر آدمی آخرت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مگر ہر سفر یکساں نہیں۔ ایک سفر وہ ہے جو خدا کے مقرر کیے ہوئے سیدھے راستہ پر جاری ہو۔ دوسرا سفر وہ ہے جس میں آدمی خود اپنی رائے کے تحت ٹیڑھے راستہ پر دوڑنے لگے۔

دونوں سفروں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ سیدھے راستہ پر اپنا سفر طے کریں گے، وہ آخرت میں صحیح منزل پر اتریں گے۔ ان کے لیے وہاں امن اور راحت کی زندگی ہوگی۔ اس کے برعکس جو لوگ ٹیڑھے راستہ پر سفر کریں گے، ان کی سواری جب آخرت کے عالم میں پہونچے گی تو وہ بربادی کے مقام پر گر پڑے گی اور ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہو جائے گی۔

روشن مستقبل

الرسالہ مارچ ۱۹۸۹ کے سرورق پر لکھا گیا تھا ——— ہر قسم کے فساد کے خلاف سب سے بڑا روک صرف ایک ہے : اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔

اس میں شک نہیں کہ یہی فسادات کو روکنے کا واحد کارگر اصول ہے۔ اس کے سوا جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ سب کی سب صرف جھگڑے کو بڑھانے والی ہیں نہ کہ اس کو ختم کرنے والی۔ مزید یہ کہ اس اصول کا تعلق صرف ہندستان سے نہیں، بلکہ تمام دنیا سے ہے۔ خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ایک قوم کا معاملہ ہو یا کئی قوموں کا معاملہ، ہر جگہ فساد سے بچنے اور پر امن زندگی گزارنے کا یہی بے خطا اصول ہے۔ مسلمانوں کو جہاں کہیں بھی پر امن زندگی حاصل ہے، وہ اسی لیے حاصل ہے کہ وہاں انھوں نے یہ قیمت ادا کر دی ہے۔ اور جہاں کہیں انھیں پر امن زندگی حاصل نہیں، وہ اسی لیے حاصل نہیں کہ وہاں وہ یہ ضروری قیمت دینے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔

مسلمانوں کے لیڈر اور دانشور اب تک جس روش پر قائم رہے ہیں، اس کو، ایک لفظ میں، دل کی بھڑاس نکالنا کہا جا سکتا ہے۔ مگر الفاظ بول کر دل کی بھڑاس نکالنا کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ ضرورت ہے کہ اب اس معاملہ میں اپنی کوششوں کو نتیجہ رخی (Result-oriented) بنایا جائے۔ مسئلہ کا حل تلاش کرنے پر ساری توجہ صرف کی جائے نہ کہ مسئلہ کے خلاف لفظی احتجاج کرنے پر۔

ہندستان کے فسادات

ہندستان میں پچھلی آدھی صدی سے فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں۔ ان فسادات کی کہانی ہمیشہ تقریباً ایک ہوتی ہے۔ انتہا پسند ہندوؤں کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز کارروائی کی جاتی ہے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کرتے ہیں۔ اب نزاع بڑھتی ہے، یہاں تک کہ باقاعدہ فساد ہو جاتا ہے جو بالآخر مسلمانوں کے سخت جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتا ہے۔

ایسے موقع پر مسلم رہنما اور دانشور ہمیشہ مسلمانوں کے ردعمل کو یہ کہہ کر جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ جوابی طور پر پیش آیا۔ اس سلسلہ میں کوٹہ (راجستھان) کے فساد کی مثال لیجئے۔ ایک مسلم انگریزی ہفت روزہ (۸ - ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹) کی اپنی رپورٹ کے مطابق، ۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ کو کوٹہ میں ہندوؤں نے اننت چتردشی کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس مسلم علاقہ سے گزرا۔ وہاں اس نے اشتعال انگیز نعرے لگائے جو مسلمانوں کے جذبات

کہ وہ ان کا قریبی دوست ہو۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۱۰۱)

مذکورہ آیت اور حدیث اور صحابی کی تشریح کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان کے موجودہ حالات میں مسلمان جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ سراسر شریعت اسلامی کے خلاف ہے۔ مسلمان ردعمل کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وہ صبر واعراض کا طریقہ اختیار کریں۔

مسلمان اپنے نام نہاد رہنماؤں کے بتائے ہوئے حل پر پچاس برس تک کم از کم پچاس ہزار بار عمل کر چکے اور ہمیشہ ناکام رہے۔ اب انھیں خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقہ کا تجربہ کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ مسلمان برائی کے بدلہ میں بھلائی کی روش اختیار کریں۔ وہ شور کا جواب خاموشی سے دیں اور نفرت کے مقابلہ میں محبت کا مظاہرہ کریں۔

خدا نے اپنی دنیا کا جو نظام بنایا ہے اس میں برائی کا خاتمہ جوابی برائی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ برائی کے جواب میں بھلائی کی جائے۔ خدا کی دنیا میں صبر کی طاقت غصہ سے زیادہ ہے۔ یہاں جہالت کے مقابلہ میں برداشت زیادہ وزن رکھتی ہے۔ یہاں انتقام کے بجائے معاف کر دینا اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ یہاں دشمن کو زیر کرنے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ دوستی اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے۔

نرمی اور تحمل کے طریقہ کی اہمیت حدیث میں مختلف طریقوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بتائی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ تعالیٰ رفیق یحب الرفق ویُعطی علی الرفق مالا یُعطی علی العنف ومالا یعطی علی ما سواہ۔۔۔ انّ الرفق لایکون فی شیئٍ الا زانہ ولا یُنزع من شیئٍ الا شانہ۔۔۔ من یحرم الرفق یُحرم الخیر (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۰۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرم و مہربان ہے اور نرمی و مہربانی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا اور نہ کسی اور چیز پر دیتا۔ نرمی جس چیز میں بھی ہو وہ اس کو زینت دے گی۔ اور وہ جس چیز سے بھی اٹھ جائے وہ اس کو عیب دار بنا دے گی۔ جو شخص نرمی سے خالی ہو وہ ہر بھلائی سے خالی ہو جائے گا۔

صبر و اعراض ایک اعلیٰ ترین حفاظتی تدبیر ہے۔ اس تدبیر کے ذریعہ آپ فساد کے ہر بم کو یقیناً ناکارہ

(De-fuse) کر سکتے ہیں ۔ یہ حل ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے ۔ اس کو اختیار کر کے مسلمان اپنا مسئلہ بھی حل کریں گے ، اور اسی کے ساتھ انھیں عبادت کا ثواب بھی حاصل ہوگا ، کیونکہ یہ حل خود خدا و رسولؐ کی طرف سے ہمیں بتایا گیا ہے ۔

مثبت طرزِ عمل کی مثال

اوپر کوٹہ اور بدایوں کی مثال نقل کی گئی ہے جب کہ مسلمانوں نے منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کیا اور اس کا برا انجام ان کے سامنے آیا ۔ اب اس کے برعکس دو مثالیں لیجئے جب کہ مسلمانوں نے جوابی کارروائی سے پرہیز کرتے ہوئے مثبت روش اختیار کی ۔ اس کے نتیجہ میں ان کے جان و مال بربادی سے محفوظ رہے ۔

فروری ۱۹۸۹ میں شیوگنج (راجستھان) میں بیڈگواڑ جنم شتابدی کے موقع پر ہندوؤں نے جلوس نکالا ۔ جلوس مقامی جامع مسجد کے سامنے پہنچ کر اشتعال انگیز نعرے لگانے لگا ۔ مگر وہاں کوئی مسلمان ان کا جواب دینے یا روک ٹوک کرنے کے لیے سامنے نہیں آیا ۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسجد کے امام مولانا خدا بخش بلوچ باہر نکلے ۔ انھوں نے جوابی اشتعال کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سادہ طور پر یہ کیا کہ جلوس کے افراد سے دوستانہ ملاقات شروع کر دی ۔ ان کے "آداب عرض" کو دیکھ کر جلوس کے نوجوان بھی "مولوی جی نمستے ، مولوی جی نمستے" کے الفاظ بولنے لگے ۔ اس کے بعد جلوس کا سارا زور اپنے آپ ختم ہو گیا ۔ پانچ منٹ میں لوگ ٹھنڈے ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے ۔

دوسری مثال دہلی کی ہے ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو وشو ہندو پریشد کی طرف سے دہلی میں " وراٹ ہندو سمیلن " منایا گیا ۔ بوٹ کلب پر بڑی تعداد میں ہندو جمع ہوئے ۔ وہاں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور مخالفانہ نعرے لگائے گئے ۔ ہندوؤں کا یہ ہجوم بوٹ کلب سے واپس ہوا تو وہ مسلم مخالف نعرے لگا رہا تھا ۔ مثلاً " ہندو بن کر رہنا ہوگا ، بندے ماترم کہنا ہوگا " وغیرہ ۔ انھوں نے اپنے راستہ میں مسجدوں کی بے حرمتی کی ۔ نئی دہلی کی ایک مسجد کا بورڈ توڑ ڈالا ۔ وغیرہ

یہ سب کچھ ہوا ۔ مگر دہلی کے مسلمان پوری طرح اعراض کی پالیسی پر قائم رہے ۔ انھوں نے سنا مگر اپنے کان بند کر لیے ۔ انھوں نے دیکھا مگر اپنی نظریں پھیر لیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ ۲۲ ستمبر کو دہلی میں کوئی فساد ہوا اور نہ اس کے بعد ۔ ہندوؤں کے مخالفانہ الفاظ وقتی شور و غل بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے ۔

یہ صرف دو مثالیں نہیں ہیں ۔ اس طرح کی مثالیں بڑی تعداد میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں ۔ حقیقت یہ

ہے کہ فساد ہونے کے مقابلہ میں فساد نہ ہونے کے واقعات کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ مگر اول الذکر واقعات اخباروں میں چھپ کر مشہور ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر واقعات اخباروں میں نہیں چھپتے، اس لیے وہ لوگوں کے علم میں بھی نہیں آتے۔

صحابی کی نصیحت

ہندستان کے فسادات کا بہترین حل وہ ہے جو ایک صحابی نے ۱۴ سو سال پہلے بتا دیا تھا یہ حضرت عُمیر بن حبیب بن خُماشہ ہیں۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

من لا یرضی بالقلیل مما یأتی بہ السفیہ یرضی بالکثیر (حیاۃ الصحابہ، الجزء الثانی، صفحہ ۶۴۷)

جو شخص نادان کی طرف سے پیش آنے والی چھوٹی تکلیف پر راضی نہ ہوگا اس کو نادان کی طرف سے بڑی تکلیف پر راضی ہونا پڑے گا۔

صحابی کے اس قول میں زندگی کی ایک حقیقت بتائی گئی ہے۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں جتنی بامعنی تھی، اتنی ہی بامعنی وہ آج بھی ہے۔ وہ جس طرح مسلم اکثریت کے ملک میں اہمیت رکھتی تھی، اسی طرح وہ غیر مسلم اکثریت کے ملک میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں بہر حال دوسروں کی طرف سے تکلیف کی باتیں پیش آتی ہیں۔ یہاں عقل مندی اور کامیابی یہ ہے کہ ابتدائی چھوٹی تکلیف کو برداشت کر لیا جائے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو معاملہ بڑھتا ہے اور زیادہ بڑی تکلیف سے سابقہ پیش آتا ہے۔ بڑی تکلیف سے بچنے کا واحد راز چھوٹی تکلیف کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہی کامیاب زندگی کا واحد اصول ہے، خواہ گھر کا معاملہ ہو یا سماج کا معاملہ یا پورے ملک کا معاملہ۔

اس کی ایک مثال جلوس کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندوؤں کا جلوس باجا بجاتا ہوا مسجد کے سامنے سے گزرتا تھا اس وقت مسلمانوں نے باجا کو برداشت نہیں کیا اور جلوس کی روٹ بدلنے پر اصرار کیا۔ اس سے مسئلہ تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ بعد کو مزید یہ خرابی پیدا ہوئی کہ ہندوؤں کا جلوس اسی کے ساتھ مسلم مخالف نعرے بھی لگانے لگا۔ اس پر مسلمانوں نے دوبارہ روک ٹوک کی۔ اب یہ ہوا کہ جلوس اور نعرہ تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ اس میں تیسری چیز کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ کہ جلوس باجے اور نعرے کے ساتھ ٹرک میں پتھر بھر کر چلنے لگا تاکہ مسجدوں اور مسلم محلوں پر خشت باری کرتا ہوا گزرے۔ مزید یہ کہ پہلے اگر جلوس سال میں چند بار

نکلتا تھا تو اب وہ روزانہ اور ہر جگہ نکلنے لگا۔

بڑھتے ہوئے مسائل کی یہ صورت حال صحابی کی نصیحت کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی ردعمل کی سیاست کو بالکل بے فائدہ ثابت کر رہی ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان صحابی کی مذکورہ نصیحت کی اہمیت کو سمجھیں اور ردعمل کی روش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔

دوسری غلطی نہیں

فساد کا حل سادہ لفظ میں صرف ایک ہے ——— "دوسری غلطی نہ کیجئے"۔ ایک فریق کی طرف سے کی جانے والی پہلی غلطی کبھی فساد تک نہیں پہنچ سکتی، جب تک فریق ثانی دوسری غلطی نہ کرے۔ جس طرح دونوں ہاتھوں کو حرکت میں لائے بغیر تالی نہیں بجتی، اسی طرح صرف پہلی غلطی فساد برپا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ مسلمان اگر یہ طے کر لیں کہ وہ فرقہ پرست عناصر کی پہلی غلطی کے باوجود کبھی دوسری غلطی نہ کریں گے تو صرف اس ایک فیصلہ سے وہ فساد کے امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔

پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا فساد کو پھیلنے کا موقع دینا ہے۔ اس کے برعکس جب پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کی جائے تو فساد اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو کر رہ جائے گا۔ پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا گویا آگ پر پٹرول ڈالنا ہے، اور پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کرنا گویا آگ پر پانی ڈالنا۔

مسلمان ہر سال بے شمار تعداد میں سیرۃ النبیؐ کے جلسے کرتے ہیں۔ ان جلسوں میں پر فخر طور پر کہا جاتا ہے کہ "سلام اس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں"۔ مسلم شعراء جوش و خروش کے ساتھ اس قسم کی نظمیں پڑھتے ہیں:

راہ میں جس نے کانٹے بچھائے گالی دی پتھر برسائے   اس پر چھڑکی پیار کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کی جس صفت کو بطور فخر پیش کرتے رہے ہیں، اس کو اپنی زندگیوں میں بطور نمونہ اختیار کر لیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے امتی بھی بن جائیں گے اور اسی کے ساتھ تعصب اور ظلم اور فساد کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا جس طرح وہ رسول اور اصحاب رسول کے لیے اسی طریقہ کو اختیار کرنے کی بنا پر ختم ہو گیا تھا۔

داعیانہ اخلاق

صبر و اعراض کی اہمیت صرف اس لحاظ سے نہیں ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کا حل ہے۔ اس

سے بڑھ کر یہ کہ اپنی داعیانہ حیثیت کی بنا پر مسلمانوں کو لازماً ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مسلمان خدا کی طرف سے خدا کے دین کا داعی ہے۔ ہندو اور دوسری تمام قومیں اس کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جو لوگ مدعو کی حیثیت رکھتے ہوں، ان کے بارہ میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گواریوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان تناؤ کی فضا پیدا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ تناؤ کی فضا میں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں کی داعیانہ حیثیت ان کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری قرار دیتی ہے کہ وہ برادران وطن سے حریف اور رقیب کا برتاؤ نہ کریں۔ بلکہ وہ ان کے ہمدرد اور خیر خواہ بنیں۔ مسلمانوں کے اوپر لازم ہے کہ وہ برادران وطن کی ایذا رسانی پر آخری حد تک صبر کریں۔ وہ ان کی ایذا رسانی کے باوجود ان کے حق میں دعائیں کریں۔ وہ دل سے ان کی اصلاح اور نجات کے حریص بن جائیں۔

آخرت میں امت محمدی کو جو سب سے بڑا اعزاز ملنے والا ہے وہ شہداء علی الناس کا اعزاز ہے۔ مگر یہ اعزاز صرف انھیں لوگوں کو ملے گا جنھوں نے دنیا میں خدا کے دین کی شہادت دی ہو۔ اور اس شہادت (گواہی) کی راہ میں یک طرفہ صبر و اعراض کی وہ قربانی دی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔

آخری بات

اب موجودہ حالات میں مسلمانوں کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک، نام نہاد رہنماؤں کا طریقہ جو ان کو ردعمل کے راستہ پر چلنے کا سبق دے رہا ہے۔ دوسرا، خدا و رسول کا طریقہ جو انھیں پکار رہا ہے کہ ردعمل سے بچو اور صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ رہنماؤں کا طریقہ ذلت اور بربادی کی طرف لے جاتا ہے، اور خدا و رسول کا طریقہ عزت اور کامیابی کی طرف۔ اب مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس طریقہ کو اپنے لیے پسند کر رہے ہیں۔

تازہ واقعات امید افزا طور پر بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں نیا شعور جاگا ہے۔ اب تک مسلمانوں میں یہ روایت جاری تھی کہ جب بھی ہندوؤں کا کوئی جلوس مسجد کے سامنے سے گزرے یا ہندوؤں کی ایک جماعت کوئی مخالفانہ نعرہ لگا دے تو مسلمان فوراً اس کو اپنے لیے قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتے تھے اور ایسے لوگوں سے لڑنے بھڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں بار بار فرقہ وارانہ فساد پیش آتا تھا۔ اب اس کے برعکس منظر سامنے آرہا ہے۔ جگہ جگہ مسلمان ایسا کر رہے ہیں کہ وہ ایسے واقعات کو ناقابل لحاظ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس

طرح فساد کا ٹائم بم اپنے آپ ناکارہ ہو کر غیر موثر ہو جاتا ہے۔

یہ ایک نئے مستقبل کی علامت ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ صبر واعراض کی نئی روایت مسلمانوں میں قائم ہو جائے جس طرح ماضی میں ردعمل کی روایت ان کے درمیان قائم ہو گئی تھی۔ لوگ ناپسندیدہ باتوں کو اسی طرح نظر انداز کرنے لگیں جس طرح اس سے پہلے وہ ان سے الجھ جایا کرتے تھے۔ مستقبل کے افق پر صبح کا اجالا ظاہر ہو چکا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ایک روشن سورج ان کے اوپر اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگے۔

ایک سفر

۲۵ سے ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ تک طرابلس (لیبیا) میں ایک انٹرنیشنل سیمینار ہوا۔ اس سیمینار کا موضوع تھا ـــــ الدعوة الاسلامية على ابواب قرن جديد

Islamic call in the threshold of a new century.

اس سیمینار کے دعوت نامہ پر ایک سفر ہوا۔ وہاں پیش کرنے کے لئے میں نے جو مقالہ تیار کیا، اس کا عنوان یہ تھا:

Islam in 21st century

یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی اور اردو الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہاں سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۳ ستمبر ۱۹۸۹ کی شام کو دہلی سے پی آئی اے کی فلائٹ ۲۹۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کی سروس انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کے مطابق تھی۔ کراچی تک ایک گھنٹہ ۵۴ منٹ کی پوری پرواز نہایت ہموار رہی۔ جہاز کے اندر مطالعہ کے لئے پاکستان کے اردو اور انگریزی اخبار موجود تھے۔

اخبارات کا مطالعہ میرے لئے کچھ زیادہ خوشی کا باعث نہ ہو سکا۔ اخبارات میں لفظی کشتی کا منظر دکھائی دیا۔ پنجاب کے ریاستی وزیر کی تقریر اسلام آباد کے مرکزی وزیر کے خلاف۔ اور مرکزی وزیر کی تقریر پنجاب کے ریاستی وزیر کے خلاف۔ جماعت اسلامی کے لیڈر کا بیان مہاجر لیڈر کے خلاف اور مہاجر لیڈر کا بیان جماعت اسلامی کے لیڈر کے خلاف۔ اسی قسم کی خبریں اخبارات کے صفحہ اول کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ اس سے یہ تو اندازہ ہوا کہ موجودہ پاکستان میں جمہوریت ہے مگر اہل پاکستان شعوری اعتبار سے شاید ابھی اس درجہ کو نہیں پہنچے کہ وہ جمہوریت کا تحمل کر سکیں۔

پاکستان ہندو اور مسلم اختلاف سے بچنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ "خدا داد ملک" میں مسلم اور مسلم اختلاف اس سے بھی شدید صورت میں موجود ہے۔

ہوائی جہاز میں میری سیٹ کے قریب ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ ہوابازی کے انجنیئر ہیں اور انھوں نے پائلٹ کی ٹریننگ لی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ

یہ بتائیے کہ جہاز کیسے اڑتا ہے۔ انھوں نے اس کی کچھ تشریح کی۔ اس کے بعد کہا کہ جہاز کے اڑنے کا اصول اگرچہ بے حد سادہ ہے مگر اس کو قطعی صورت میں صرف ریاضیاتی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے، غیر ریاضیاتی زبان میں اس کو قطعیت کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں۔

یہی اصول دوسرے معاملات کے لئے بھی ہے۔ شلاً قومی تعمیر یا اسلامی احیاء کے معاملہ کو بھی صحیح طور پر شعر وخطابت کی زبان میں یا چڑیا چڑے کی کہانی کے طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو لازماً علمی زبان میں بیان کرنا پڑے گا۔

آجکل یہ حالت ہے کہ ملی تعمیر یا اسلامی احیاء کے کام کو اگر زیادہ گہرائی کے ساتھ بتایا جائے تو بعض لوگ کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو فلسفہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے ایک معاملہ کو صحیح طور پر "فلسفہ" ہی کی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اس کو فلسفہ کی زبان میں سمجھنا نہ چاہیں وہ ہمیشہ کے لئے اس کی حقیقی معرفت سے محروم رہیں گے۔

جہاز میں ایک رفیق سفر نے کہا کہ قرآن میں صرف دو سفروں کا ذکر ہے۔ خشکی کا اور سمندر کا (وحملناهم فی البر والبحر)، مگر موجودہ زمانہ میں ہوائی سفر بھی ایک مستقل سفر بن گیا ہے۔ اس کا مطلب کیا یہ لیا جاسکتا ہے کہ قرآن "دو سفروں" کے دور کی کتاب ہے، وہ "تین سفروں" کے دور کی کتاب نہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں سفر کی قسمیں تین ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ ہیں۔ شلاً انڈرگراؤنڈ ریلوں کا تحت زمین سفر، یا راکٹ کا بالائے خلا سفر۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک عام اسلوب کلام ہے کہ ایک معروف چیز کا ذکر کرکے اس کے ذیل کی دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے، کیوں کہ وہ اس کے تابع ہونے کی بنا پر خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ شلاً آپ کہیں کہ "جمہوری نظام میں حکمراں کو اپوزیشن کی طرف سے بہت سی تلخ باتیں سننی پڑتی ہیں"۔ اس فقرہ میں بظاہر صرف "سننے" کا ذکر ہے مگر تبعیت کے اصول کے تحت اس میں "پڑھنا" بھی اپنے آپ شامل ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سی تلخ باتیں سننا اور پڑھنا پڑتا ہے۔

یہی معاملہ قرآن کی مذکورہ آیت کا ہے۔ اس میں بظاہر اگرچہ صرف بَر اور بحر میں سفر کا ذکر ہے مگر سفر کے ذیل کے دوسرے تابع مفہوم بھی اس میں اپنے آپ شامل ہیں۔ شلاً بر کی تابعیت میں تحت زمین سفر، اور بحر کی تابعیت میں فوق زمین (ہوائی اور خلائی) سفر۔

اس سے پہلے ایک سفر کے دوران میں نے کراچی ایر پورٹ کی مسجد میں نماز ادا کی تھی (الرسالہ مئی ۱۹۸۷، صفحہ ۲۲) اس سفر میں دوبارہ کچھ وقت اس خوب صورت مسجد میں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ اس مسجد کو دیکھ کر خیال ہوا کہ ایر پورٹ کے اندر مسجد کا ہونا شاید اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ ایر پورٹ کسی مسلم ملک میں واقع ہو۔ مگر پھر یاد آیا کہ اب زمانہ غیر معمولی طور پر بدل چکا ہے چنانچہ اب اٹلی اور اسپین جیسے ملکوں میں بھی شاندار مسجدیں بن رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے حالات میں ایسی تبدیلی کی ہے کہ اب خود سیکولر ملک محسوس کر رہے ہیں کہ "مسجد" ان کے سیکولرزم پر دھبہ نہیں۔ بلکہ مسجد ان کی سیکولرزم کی قبا پر ایک تصدیقی تمغہ ہے۔ چنانچہ فرانس میں پاکستان کا واقعہ دہرایا جا رہا ہے۔ فرانس کی راجدھانی پیرس میں اورلی ہوائی اڈہ (Orly International Airport) ہے۔ وہ دنیا کے ان ۴۲ بڑے ہوائی اڈوں میں شمار ہوتا ہے جہاں سالانہ ایک کروڑ سے زیادہ مسافر چڑھتے اور اترتے ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ اس فرانسیسی ہوائی اڈہ پر ایک مسجد بنائی گئی ہے تاکہ یہاں سے گزرنے والے مسلمان مسافروں کو عبادت گزاری کی سہولت حاصل ہو سکے۔

کراچی ایر پورٹ پر کئی گھنٹے انتظار میں گزرے۔ میں ایک سیٹ پر بیٹھا ہوا کچھ یادداشتیں نوٹ کرنے میں مشغول تھا۔ میرے پاس کی سیٹ پر ایک مسلمان لڑکی آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی: "انکل، آپ شاعر ہیں"۔ میں نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ میں نے اس سے مزید کچھ نہ کہا اور نہ کچھ پوچھا۔ تاہم میں سوچتا رہا کہ اس نے ایسا سوال کیوں کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ لوگ لکھنے کے نام سے صرف تفریحی لکھنے کو جانتے ہیں، وہ سمجھ نہیں پاتے کہ کوئی شخص کسی سنجیدہ مقصد کے لئے بھی قلم کاغذ میں مشغول ہوگا۔

کراچی ایر پورٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے میں امیگریشن کی کھڑکی پر کھڑا تھا۔ میں کئی آدمیوں کے پیچھے تھا۔ پولیس کے آدمی نے مجھے آگے کر دیا۔ ایک مسافر نے کہا کہ یہ تو پیچھے تھے۔ "یہ بزرگ ہیں" اس نے جواب دیا۔ اس نے فوراً میرے پاسپورٹ پر ضروری اندراج کرایا اور مجھے دیتے ہوئے کہا: ہمارے لئے دعا کیجئے گا۔" یہ میرے بڑھاپے کی قیمت تھی۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں اگر "طاقت ور" ہونا اپنے اندر کچھ ایڈوانٹج رکھتا ہے تو یہاں "کمزور" ہونے کے بھی کچھ ایڈوانٹج ہیں۔ مگر اس کا فائدہ اسی شخص کو ملتا ہے جو فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع دے اور عاجلانہ مداخلت کر کے فطرت کا نقشہ بگاڑ

نہ ڈالے۔

کراچی سے طرابلس کے لئے لیبین ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۶۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ دروازہ پر پہنچا تو مسافروں کے کاغذات اور سامان کی زبردست چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرا حلیہ دیکھ کر جہاز کے عملہ کے ایک عرب رکن نے پوچھا کہ آپ کانفرنس میں جا رہے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد اس نے کسی قسم کی چیکنگ کئے بغیر اندر داخل کر دیا۔

دل سے دعا نکلی کہ کاش آخرت میں بھی ایسا ہی معاملہ ہو۔ صرف نام پوچھ کر آگے بڑھا دیا جائے۔ رحمتوں کے دروازہ میں بلا حساب کتاب داخلہ مل جائے۔ اور بلاشبہ یہ اللہ کے لئے مشکل نہیں۔

کراچی سے طرابلس کا سفر متواتر سات گھنٹہ کا تھا۔ شروع میں خیال آیا کہ یہ بڑا تکلیف دہ سفر ہوگا۔ مگر دوران پرواز نیند آتی رہی۔ اس لئے اس کا بڑا حصہ سونے میں گزر گیا۔ صبح کو ہمارے پیچھے کی طرف شفق کا اجالا ظاہر ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورا اجالا ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر جہاز گھنٹوں تک اسی حالت میں پرواز کرتا رہا۔ جب بھی میں باہر کی طرف دیکھتا تو محسوس ہوتا کہ اجالا بے حد سست رفتار کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا یہ سفر مشرق سے مغرب کی طرف ہو رہا تھا۔ یعنی طلوع آفتاب کے الٹی طرف۔ یہی "سمت سفر" کا معاملہ تھا جس نے اجالا ہونے میں اتنی تاخیر کر دی۔ زمین کی گردش اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اگر آپ اپنے مقام پر صبح کے وقت کسی ٹیلہ پر کھڑے ہوں تو سورج آپ کی طرف ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آ رہا ہوگا۔ چنانچہ بہت جلد اجالا ظاہر ہو جائے گا۔ لیکن ہوائی جہاز کے ذریعہ جب آپ مشرق سے مغرب کی طرف آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہے ہوں تو اس وقت آپ کے لئے سورج کے سفر کی رفتار گھٹ کر صرف دو سو میل فی گھنٹہ رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی حالت میں اجالے کے ظہور میں تاخیر ہو جاتی ہے۔

واپسی کے وقت ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کو اس کے برعکس صورت پیش آئی۔ یہ سفر مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ صبح کو شفق کی سرخی ظاہر ہوئی۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ اجالا ہونے لگا۔ ایسے وقت میں اگر آپ ہوائی جہاز کے ذریعہ آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مغرب سے مشرق کی طرف اڑ رہے ہوں تو صبح کا اجالا آپ کی طرف ۱۸ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آتا ہوا دکھائی دینے لگے گا۔

وقت کی سمت کے خلاف چلنا بھی سفر ہے، اور وقت کی سمت کی طرف چلنا بھی سفر۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں میں اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ ایک شخص اگر "۲۰۰ میل" فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہو تو دوسرے کے سفر کی رفتار "۸۰۰ میل" فی گھنٹہ تک پہنچ جائے گی۔

لیبین ایرویز کا مخفف ایل اے (L.A.) ہے۔ اس سلسلہ میں بعض لیبیوں کے درمیان ایک لطیفہ مشہور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایل اے کا مطلب ہے Late Always ان کا کہنا ہے کہ لیبین ایر لائنز کے جہاز اکثر کافی لیٹ رہتے ہیں۔ مگر موجودہ سفر میں وہ تقریباً صحیح وقت پر پہنچا۔ اس دنیا میں ہر عموم میں استثنا ہے اور ہر استثنا میں عموم۔

لیبیا کے پاس دولت کی افراط ہے، اس کے باوجود لیبین ایر لائنز خستہ حالت میں ہے۔ اس کے پاس جہازوں کی بے حد کمی ہے۔ موجودہ جہاز پرانے ہو چکے ہیں۔ فاضل پرزے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی مرمت سخت مشکل ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ نے لیبیا کو جہازوں کی سپلائی بند کر دی ہے۔ دوسری طرف خلیج کی ہوائی کمپنیاں نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ کیونکہ امریکا ان کے اوپر اپنی مشینی عنایتیں جاری کئے ہوئے ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو مسائل ہیں، ان کا سبب اغیار کا ظلم و تعصب نہیں۔ اس کا اصل سبب مسلمانوں کی یہی پس ماندگی ہے۔ موجودہ مسلمان ہر جگہ پانے کی حد (Receiving end) پر ہیں۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو جائے ان کا انجام وہی ہوگا جو اس وقت ساری دنیا میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ افغانستان میں امریکہ نے ہتھیار دیا تو اس کی مدد سے افغانی مجاہدین نے روسیوں کو ملک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ فلسطین میں امریکہ مدد نہیں کر رہا ہے تو وہاں عرب مجاہدین اور سارا عالم اسلام نصف صدی سے بالکل عاجز ثابت ہو رہا ہے۔ پاکستان کو امریکہ نے اپنی سرپرستی میں لے رکھا ہے تو وہاں خوش حالی ہے۔ بنگلہ دیش کو امریکہ نے نظر انداز کر دیا تو وہ بدترین بدحالی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ مسلمان اس وقت ساری دنیا میں "حبل من الناس" کے تحت جی رہے ہیں نہ کہ "حبل من اللہ" کے تحت (آل عمران ۱۱۲)

۲۴ ستمبر ۱۹۸۹ کو میں طرابلس پہنچا۔ یہاں میرا قیام فندق باب البحر (کمرہ ۹۳۰) میں تھا۔

۱

ہوٹل میں سب سے پہلی چیز جو پڑھنے کو ملی وہ اخبار الدعوۃ الاسلامیہ (۲۰ ستمبر ۱۹۸۹) تھا۔ اس میں پہلے صفحہ پر ایک خبر تھی۔ یہ خبر فائننشل ٹائمز سے نقل کی گئی تھی۔ لندن کے اس اخبار نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ انڈونیشیا میں بڑی تعداد میں غیر مسلم افراد اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مسیحی مبلغین کی زبردست مخالفانہ کوشش کے باوجود وہاں اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ فائننشل ٹائمز نے لکھا تھا کہ وہاں اس طرح اسلام کی اشاعت کی وجہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کی تمام مانگوں کی تکمیل کرتا ہے:

The reason for such increase, is that
Islam fulfills all requirements of life.

ہر سچا مذہب ابتداءً انھیں صفات کا حامل تھا جو آج اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ مگر تحریف اور تبدیلی کے نتیجہ میں اب یہ تمام صفات صرف اسلام میں رہ گئی ہیں۔ دوسرے مذاہب کو انسان کی تحریفات نے ان صفات سے محروم کر دیا۔ لوگوں پر اگر یہ بات واضح ہو جائے تو وہ اسلام کی طرف آنے کو تبدیلی مذہب نہ سمجھیں۔ بلکہ اس کو خود اپنے ہی اصل مذہب کی طرف واپسی کے ہم معنی قرار دیں۔

سفر کے لئے روانگی سے ایک دن پہلے دہلی میں ہفت روزہ الجمعیۃ (۲۲ ستمبر ۱۹۸۹) دیکھا۔ اس کی ایک سرخی یہ تھی: قذافی کے رویہ میں حیرت ناک تبدیلی۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ اب ایک سال سے معمر قذافی اپنی پالیسیوں میں زبردست تغیر کرتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اب امن اور مصالحت اور دوستی کی راہ اپنائی ہے۔ اس قسم کی باتوں کی وجہ سے عرب ملکوں کے ساتھ قذافی کے تعلقات میں سدھار آیا ہے۔ اور لوگوں کی طرف سے عام طور پر مثبت ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے (صفحہ ۲)۔

یہ "تبدیلی" لیبیا کے سفر میں مختلف اعتبار سے محسوس ہوئی۔ اس کو جوش سے ہوش کی طرف واپسی کہا جا سکتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ تک ترکی عالم عرب کا قائد تھا۔ عثمانی خلافت کے خاتمہ کے بعد کچھ لوگوں نے ناکام طور پر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔ جمال عبد الناصر کا عالم عرب کا قائد بننے کا خواب نہ صرف بے تعبیر رہا بلکہ انھوں نے عرب دنیا کی بربادی میں مزید اضافہ کیا۔ اس کے بعد آیات اللہ خمینی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے۔ مگر انھوں نے بھی اپنے پیچھے بربادی کے سوا کوئی تاریخ نہیں چھوڑی۔ بظاہر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیبی لیڈروں کو بھی اپنے بارہ میں یہی خوش گمانی ہو گئی تھی جواب اپنے آپ ختم ہو رہی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف دو میں سے کوئی ایک چیز ممکن ہے۔ یا تو تمام مسلم ممالک اپنے اپنے دائرہ میں محدود ہو کر رہیں۔ اور اگر وہ کسی بھی درجہ میں اپنے آپ کو متحدہ بلاک کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو عملی طور پر اس کی صرف ایک ہی ممکن صورت ہے۔ وہ یہ کہ تمام ملک سعودی عرب کی علامتی قیادت کو تسلیم کر لیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سعودی عرب کے پاس "مکہ مدینہ" ہے۔ مسلمانوں کے پاس عالمی اتحاد کی یہی ابدی بنیاد ہے۔ مذہبی سطح پر آج بھی یہی چیز ان کو متحدہ ملت کا شعور دئے ہوئے ہے۔ اسی طرح یہی وہ چیز ہے جو سیاسی سطح پر ان کے لئے اتحاد کی ممکن بنیاد بن سکتی ہے

اٹلی نے ۱۹۱۱ میں طرابلس پر حملہ کیا۔ وہ ۱۹۴۳ تک اس پر قابض رہے۔ اس وقت یہاں ترکوں کی حکومت تھی۔ ایچ جی ویلز (H.G. Wells) نے اپنی کتاب "آؤٹ لائن آف ہسٹری" میں لکھا ہے کہ اٹلی کے سامراجیوں نے اپنے ہم وطنوں کو ابھارا کہ وہ مزینی کو بھول جائیں اور جولیس سیزر کو یاد رکھیں:

> The Italian imperialists exhorted their countrymen to forget Mazzini and remember Julius Caesar (p. 1058).

جی مزینی (Giuseppe Mazzini) ۱۸۰۵ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۷۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ اٹلی کا مشہور قومی ریفارمر تھا۔ وہ لبرل نیشنلزم کا علم بردار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قوموں کے درمیان ہتھیار کا استعمال بند ہو جانا چاہئے اور ہمشیرگی اقوام (Sisterhood of nations) کے اصول پر باہمی تعلق قائم ہونا چاہئے (14/692)

مگر اٹلی کے پرجوش حکمراں اپنے حال کے لیڈر کو بھول گئے۔ انھوں نے دو ہزار سال پہلے کے حکمراں جولیس سیزر (Julius Caesar) کی سنت پر چلنا چاہا۔ جولیس سیزر ۱۰۰ ق م میں روم میں پیدا ہوا، اور ۴۴ ق م میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس نے رومی سلطنت کی توسیع کے لئے مختلف ملکوں پر حملے کئے۔ اور بالآخر ایک کمزور روم چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا۔ (3/579)

یہی اکثر قوموں کا حال ہے۔ انھیں اپنے جنگ جو ہیرو زیادہ پسند آتے ہیں۔ اصلاحی اور تعمیری

بات کرنے والوں کو وہ اکثر غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ خواہ جنگ جو افراد نے انھیں بربادی کے سوا کچھ اور نہ دیا ہو۔

ہندستان جیسے ملکوں میں یہ مسئلہ ہے کہ ملک کی معیشت کو چلانے کے لئے پیسہ کہاں سے لایا جائے۔ لیبیا میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں، لیبیا کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تیل سے ملنے والی بے پناہ دولت کو کس طرح بہتر طور پر قوم کی ترقی کے لئے خرچ کیا جائے:

The main problem of the oil boom is how best to use the large sums of money available to promote the well-being of the nation as a whole (10/882).

رابطۂ عالم اسلامی کے تحت مکہ مکرمہ سے ایک انگریزی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام مسلم ورلڈ لیگ جرنل ہے۔ اس کے شمارہ مارچ۔ اپریل ۱۹۸۹ میں چار صفحہ کا ایک باتصویر مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Libya's New Oil Era

اس مضمون میں ایک بڑی سبق آموز بات کہی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ نے لیبیا پر تجارتی پابندیاں لگائیں اور اس کے تیل کے کارخانوں سے اپنے آدمیوں کو واپس بلالیا۔ بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ لیبیا کی اقتصادیات تباہ ہو جائیں۔ مگر نتیجہ برعکس صورت میں برآمد ہوا۔ خود امریکی کانگرس کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ لیبیا سے امریکی کمپنیوں کی واپسی کا انھیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی آمدنی میں اور اضافہ ہو گیا۔ مشکل آسانی میں تبدیل ہو گئی۔

مسلم ورلڈ لیگ جرنل کے مذکورہ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکی کمپنیوں کی واپسی سے لیبیا کو مختلف فائدے پہنچے۔ اس سے انھیں موقع ملا کہ وہ ضروری ٹکنالوجی کو خود حاصل کریں۔ اس سے ان کی حب الوطنی اور محنت میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے لیبیا کی تیل کی صنعت کو مکمل طور پر لیبی بنا لیا۔ اس کے ذریعہ سے لیبیا میں تیل کی صنعت کا ایک نیا دور آگیا (صفحہ ۶۱)

سعودی عرب کے "فیصل انعام" کی طرح لیبیا میں سالانہ "قذافی انعام" ۱۹۸۹ سے شروع کیا گیا ہے۔ لیبی حکومت نے اس مقصد کے لئے دس بلین ڈالر کا فنڈ سوئزرلینڈ کے ایک بینک میں جمع کیا ہے۔ مئی ۱۹۸۹ میں اس کے پہلے انعام کا اعلان کیا گیا۔ یہ انعام ساؤتھ افریقہ کے نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela)

کو ان کی آزادی کی کوششوں (Liberation struggles) کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ 250,000 ڈالر کی رقم شامل ہے۔ ٹائم میگزین (۸ مئی ۱۹۸۹) نے اس واقعہ کی خبر دیتے ہوئے معنی خیز طور پر اس کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی ہے ـــــ اور انعام پانے والا ہے ...

And the winner is .... (p. 21).

سعودی عرب کا فیصل انعام کسی شخص کی "اسلامی خدمات" کے اعتراف کے طور پر کسی مسلمان کو دیا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں لیبیا اگر سعودی عرب کی تقلید کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ اچھا ہوگا۔

یہاں میں نے اپنی گھڑی میں مقامی وقت کے مطابق تبدیلی نہیں کی تھی۔ جب مجھے وقت معلوم کرنا ہوتا تو میں ایسا کرتا کہ اپنی گھڑی میں ساڑھے تین گھنٹہ کا فرق کر لیتا تھا۔ اس طرح مجھے مقامی وقت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہندستان کے مقابلہ میں لیبیا کا وقت ساڑھے تین گھنٹہ پیچھے ہے۔ وقت کے آگے پیچھے ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان نے اپنی سہولت کے لئے رات اور دن کی مدت کو ۲۴ گھنٹے میں تقسیم کیا ہے۔ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہر ملک میں دوپہر کا وقت ۱۲ بجے کا وقت ہوگا۔ اب چونکہ زمین کی محوری گردش کی بنا پر "دوپہر" کا لمحہ ہر ملک میں الگ الگ وقت پر آتا ہے، ہر ملک کا وقت الگ الگ ہو گیا ہے۔ مثلاً ہندستان میں جس وقت دوپہر ہوگا، اس وقت لیبیا میں ابھی دوپہر کا وقت آنے میں تقریباً ساڑھے تین گھنٹہ باقی ہوں گے۔ ہر ملک دوپہر کے وقت کو ۱۲ بجے کا وقت مان کر اپنی گھڑی کا آغاز کرتا ہے، اس لئے ہر ملک کا وقت نسبتی طور پر الگ الگ ہو جاتا ہے۔

وقت کا یہ فرق قدرت کا ایک سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "فرق" اس دنیا کی لازمی حقیقت ہے۔ اس دنیا میں ہمیں فرق کے باوجود مل کر رہنا ہے۔ یہاں اختلاف کے باوجود اتحاد قائم کرنا ہے۔

اپنے عام طریقہ کے مطابق، میں کانفرنس کے بارہ میں "رپورٹ" کے انداز میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ کانفرنس کے اندر اور کانفرنس کے باہر پیش آنے والی صرف کچھ باتوں کو یہاں نقل کروں گا۔

کویت کے شیخ راشد عبد اللہ الفرحان نے حقوق الانسان فی الاسلام پر عربی میں تقریر کی۔ اس دوران انھوں نے غلامی کا ذکر کیا اور کہا کہ اسلام کے مخالفین اس پر سب سے زیادہ اعتراض کرتے ہیں۔ مگر قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ ہدایت نہیں کہ تم لوگوں کو غلام بناؤ۔ اسلام نے غلامی کو شروع نہیں کیا۔ وہ پہلے سے دنیا میں موجود تھی۔ اسلام نے ایسے احکام دئے جن کے ذریعہ وہ کمیت و کیفیت

کے اعتبار سے ختم ہو سکے۔ غلامی کے بارہ میں اسلام نے جو احکام وضع کئے ہیں، وہ دو مقصد کے تحت تھے۔ مزید غلام بنانے کو روکنا، اور موجودہ غلاموں کو ختم کرنا (النوع الذی شُرعت لہ الاحکام کلہا تدور حول مبدأین مُہمین ہما: تضییق المدخل وتوسیع المخرج)

غلامی کے مسئلہ کی یہ تشریح نہایت صحیح اور عین شریعت کے مطابق ہے۔ تضییق المدخل اور توسیع المخرج کا یہی اصول اسلام نے دوسری برائیوں کے استیصال کے لئے بھی اختیار کیا ہے۔

کانفرنس کی تقریریں اور مقالے زیادہ تر اصل موضوع سے غیر متعلق تھے۔ اس لئے ان کی کوئی تفصیل یہاں درج نہیں کی جارہی ہے۔ ایک صاحب نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: صرف آپ کا مقالہ مقررہ موضوع کے پوری طرح مطابق تھا۔ یہی اکثر کانفرنسوں کا حال ہوتا ہے۔

۲۸ ستمبر کی نشست میں فلپائن کی مورو لبریشن فرنٹ کے نوجوان چیرمین مسٹر نوری مسواری (NUR MISVARI) نے تقریر کی۔ ان کی انگریزی تقریر انتہائی جوشیلے انداز میں تھی۔ انھوں نے بتایا کہ فلپائن کی مسلم آبادی کے علاقہ میں آزادی کی جو لڑائی ہو رہی ہے، اس میں اب تک کم از کم ۱۳۵ ہزار مسلمان اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلپائن کے سابق صدر مارکوس کے ساتھ ہماری میٹنگ ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو میں ہر چیز دینے کے لئے تیار ہوں۔ مگر میں آپ کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں:

I am ready to give you anything except independence.

مگر مسلم لیڈروں نے جواب دیا کہ ہماری لڑائی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ہم کو صرف آزادی چاہئے، اس کے سوا کوئی اور چیز ہم کو منظور نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی جدوجہد ہر مقام پر اسی صورت حال کا شکار ہے۔ مسلمان ہر جگہ بے فائدہ قومی جنگ لڑ رہے ہیں، جس کا نام انھوں نے غلط طور پر جہاد فی سبیل اللہ رکھ لیا ہے۔ وہ دوسروں سے ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں جس کو دوسرے لوگ انھیں دینے کے لئے تیار نہیں۔ اور دوسرے لوگ جو کچھ انھیں دے رہے ہیں وہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں۔ اس قسم کی جنگ سراسر بے فائدہ ہے۔ اس کا تعلق عقل سے بھی نہیں، اسلام سے اس کا تعلق ہونا تو درکنار۔ (باقی)

خبرنامہ اسلامی مرکز ـ ۵۸

۱ـ قاہرہ (مصر) کا ایک مشہور مجلہ ہے جس کا نام روز الیوسف ہے۔ اس کے عرب نمائندہ دکتور محمد عودۃ ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹ کو اسلامی مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں نیز عالمی اسلامی تحریکوں کے بارہ میں تھے۔

۲ـ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس تقریر کا عنوان تھا: رحمۃ للعالمین۔ یہ تقریر آئندہ انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳ـ ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ "بہار میں ہونے والے فسادات کے پیش نظر مولانا منت اللہ رحمانی کی دعوت پر ۱۷ ستمبر ۱۹۸۹ کو دفتر امارت شرعیہ (پھلواری) میں مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں مسلمانوں کو یہ رہنمائی دی گئی کہ وہ ضبط وتحمل سے کام لیں اور کسی حال میں مشتعل نہ ہوں (معارف، اکتوبر ۱۹۸۹) اس طرح کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ الرسالہ کا فکر اب اس حد تک پھیل چکا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی زبانوں سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہ الرسالہ مشن کی کھلی ہوئی فتح ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو لوگ اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے کہ فساد کے بعد فرقہ پرستوں اور انتظامیہ کے خلاف بے فائدہ احتجاج و فریاد کرتے رہیں۔

۴ـ دلشاد گارڈن (دہلی) میں مسلم ویلفیر ایسوسی ایشن کی طرف سے سیرۃ النبی کا ایک جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو ہوا، اور اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر سیرت رسول کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۵ـ ستمبر ۱۹۸۹ میں صدر اسلامی مرکز کا بیرونی ملکوں کا ایک سفر ہوا۔ اس کی روداد انشاء اللہ آئندہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۶ـ الرسالہ کے مضامین ہندستانی پرچوں کے علاوہ بیرونی جرائد میں مسلسل نقل کیے جارہے ہیں۔ مثلاً کراچی کے اخبار مشرق نے اپنے شمارہ ۱۸ اگست ۱۹۸۹ میں الرسالہ کا

ایک مفصل مضمون (سائنس اور اسلام) شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ اخبار نے اپنی طرف سے حسب ذیل نوٹ شامل کیا ہے: "مولانا وحیدالدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز و مدیر ماہنامہ "الرسالہ" اردو، انگریزی) عالم اسلام کی مایہ ناز اور نادر روزگار علمی ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی اردو انگریزی تصانیف دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ترجمہ ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ وہ عصری اسلوب اور جدید تقاضوں کے مطابق دین فطرت کی صداقت و حقانیت واشگاف کرنے میں موثر اور طاقت ور دلیل و برہان سے کام لیتے ہیں۔ انھیں گزشتہ برس حکومت پاکستان کے تحت سیرت کے عالمی مقابلہ میں ان کی انگریزی کتاب (پرافٹ آف ریوولیوشن) کو پہلا انعام ملا۔ اسلام کے موضوع پر منعقد ہونے والے عالمی مذاکروں اور سمیناروں میں ان کی شرکت کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔"

۷۔ اخبار قومی فیصلہ (دہلی) کے لیے اس کے نمایندہ مسٹر محمد اجمل خاں نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۹ اکتوبر ۱۹۸۹ کو مرکز کے دفتر میں ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات زیادہ تر الرسالہ کے مشن اور مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے متعلق تھے۔

۸۔ ساہتیہ اکیڈمی (نئی دہلی) کی طرف سے ۳۱ اگست تا ۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو مدراس میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع "رادھا کرشنن اور مذہب" تھا۔ اس سمینار میں شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی گئی تھی۔ اگرچہ اپنی مصروفیات کی بنا پر وہ اس میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم اس طرح کے واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں جو بتاتے ہیں کہ آج کس طرح "مدعو" خود اپنی طرف سے اسٹیج تیار کر کے "داعی کو بلا رہا ہے کہ آؤ اور اپنی بات کہو۔ ضرورت ہے کہ آج کثرت سے انگریزی داں علماء ہوں تاکہ ان مواقع دعوت سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

۹۔ ایک صاحب پونہ سے لکھتے ہیں: "پونہ میں ایک اسلامی جماعت کا پروگرام ۲۵ اگست ۱۹۸۹ کو ہوا۔ اس میں ان کے جنرل سکریٹری وغیرہ شریک ہوئے۔ وہاں جو تقریر ہوئی وہ تمام تر الرسالہ کی پالیسی پر تھی۔ ایک مقامی پریس کانفرنس بھی تھی۔ اس میں

ایک مفصل مضمون (سائنس اور اسلام) شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ اخبار نے اپنی طرف سے حسب ذیل نوٹ شامل کیا ہے: "مولانا وحید الدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز و مدیر ماہنامہ "الرسالہ" اردو، انگریزی) عالم اسلام کی مایہ ناز اور نادر روزگار علمی ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی اردو انگریزی تصانیف دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ترجمہ ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ وہ عصری اسلوب اور جدید تقاضوں کے مطابق دین فطرت کی صداقت وحقانیت واشگاف کرنے میں موثر اور طاقت ور دلیل و برہان سے کام لیتے ہیں۔ انھیں گزشتہ برس حکومت پاکستان کے تحت سیرت کے عالمی مقابلہ میں ان کی انگریزی کتاب (پرافٹ آف ریوولیوشن) کو پہلا انعام ملا۔ اسلام کے موضوع پر منعقد ہونے والے عالمی مذاکروں اور سیمناروں میں ان کی شرکت کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔"

۷۔ اخبار قومی فیصلہ (دہلی) کے لیے اس کے نمایندہ مسٹر محمد اجمل خاں نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۹ اکتوبر ۱۹۸۹ کو مرکز کے دفتر میں ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات زیادہ تر الرسالہ کے مشن اور مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے متعلق تھے۔

۸۔ ساہتیہ اکیڈمی (نئی دہلی) کی طرف سے ۳۱ اگست تا ۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو مدراس میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع "رادھا کرشنن اور مذہب" تھا۔ اس سیمنار میں شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی گئی تھی۔ اگرچہ اپنی مصروفیات کی بنا پر وہ اس میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم اس طرح کے واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں جو بتاتے ہیں کہ آج کس طرح "مدعو" خود اپنی طرف سے اسٹیج تیار کر کے "داعی کو بلا رہا ہے کہ آؤ اور اپنی بات کہو۔ ضرورت ہے کہ آج کثرت سے انگریزی داں علماء ہوں تاکہ ان مواقع دعوت سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

۹۔ ایک صاحب پونہ سے لکھتے ہیں: "پونہ میں ایک اسلامی جماعت کا پروگرام ۲۵ اگست ۱۹۸۹ کو ہوا۔ اس میں ان کے جنرل سکریٹری وغیرہ شریک ہوئے۔ وہاں جو تقریر ہوئی وہ تمام تر الرسالہ کی پالیسی پر تھی۔ ایک مقامی پریس کانفرنس بھی تھی۔ اس میں

بھی ایسے ہی ایڈجسٹمنٹ کی باتیں تھیں ۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کا مشن کس طرح لوگوں کے فکر و خیال کو مسخر کر رہا ہے ۔

۱۰- سرینگر کے ہفت روزہ اخبار مسلم کے نمائندہ مسٹر ایم ایم شریف نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا ۔ یہ انٹرویو مرکز کے دفتر میں ریکارڈ کیا گیا ۔ سوالات کا زیادہ تر تعلق کشمیر کے مسئلہ سے تھا ۔ صدر اسلامی مرکز نے کشمیر کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ حقیقت پسند بنیں اور ماضی کو بھلا کر حال کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں ۔

۱۱- ۵ اکتوبر ۱۹۸۹ کو انبیٹھہ (سہارن پور) میں ایک سیرت کانفرنس ہوئی ۔ صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر خطاب کی دعوت دی گئی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے شرکت کی اور سیرت کے موضوع پر تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی ۔ تقریر کا موضوع تھا ——— موجودہ حالات میں سیرتِ رسول کی رہنمائی ۔

۱۲- انجمن رفاہِ ملّت (دوائم باڑی) کی طرف سے ایک خط میں بتایا گیا ہے کہ ملّت کی اصلاح کے لیے انجمن کی طرف سے شائع ہونے والے کیلنڈر میں ہر سال کچھ مضامین شائع کیے جاتے ہیں ۔ گزشتہ سال الرسالہ کے حوالہ سے اس کے مضامین " لڑائی کے بغیر بھی جیت ہوتی ہے " اور " اپنے آپ سے لڑنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اور ہاتھی کی خاموشی ۔ ۔ ۔ ۔ " وغیرہ شائع کیا گیا ۔ اس سال آپ کی کتاب باغ جنّت اور نار جہنّم سے کچھ مواد لے کر کیلنڈر میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔"

۱۳- " نقش کوکن " بمبئی کا ایک قدیم ماہنامہ ہے ۔ وہ بیک وقت دو زبانوں (اردو ، انگریزی) میں نکلتا ہے ۔ نقش کوکن ہر مہینہ بالالتزام الرسالہ کا کم از کم ایک اردو مضمون اور ایک انگریزی مضمون اپنے صفحات میں اہتمام کے ساتھ شائع کرتا ہے ۔ اسی طرح اور بہت سے جرائد الرسالہ کے مضامین متفرق طور پر نقل کرتے ہیں ۔

۱۴- " سنت نرنکاری " دہلی کا ایک ماہنامہ ہے ۔ وہ سنت نرنکاری عالمی مشن کی طرف سے بیک وقت سات زبانوں میں شائع ہوتا ہے ۔ سنت نرنکاری میں تقریباً ہر مہینہ الرسالہ کا کوئی نہ کوئی مضمون نقل کیا جاتا ہے ۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام وسیع تر حلقہ میں مسلسل پہونچ رہا ہے ۔

Delhi Postal Regd. No D(SE) 243 □ RNI 28822/76 □ January 1990 No 158 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	125/-
" " جلد دوم	125/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
دین کامل	40/-
الاسلام	30/-
ظہورِ اسلام	30/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	50/-
صراطِ مستقیم	30/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	30/-
اسلام اور عصرِ حاضر	25/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	15/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	6/-

تبلیغی تحریک	15/-
میوات کا سفر	30/-
اقوالِ حکمت	15/-
تعبیر کی غلطی	40/-
دین کی سیاسی تعبیر	12/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	7/-
تجدیدِ دین	
اسلام دینِ فطرت	5/-
تعمیرِ ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	5/-
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحادِ ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-

زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	3/-
دینی تعلیم	5/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	5/-
نارِ جہنم	5/-

God Arises	Rs. 55/-
Muhammad The Prophet of Revolution	60/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इनसान अपने आपको पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳